فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	6
انوار ربانی	جادو کی حقیقت	حمیرا خالد	8
خاص مضمون	انقلابی کلمہ حق	نعیم صدیقی	15
نوائے شوق	سفرِ شوق	ڈاکٹر مقبول احمد شاہد	20
حقیقت و افسانہ	بالشت بھر کی عورت	قانتہ رابعہ	21
	کشف	افشاں نوید	23
	مٹی کے باوے	ڈاکٹر شگفتہ نقوی	26
	کوئی ہے جو مجھے روکے	ربیعہ ندرت	34
	خواب کی تعبیر	ڈاکٹر ممتاز عمر	45
زندگی کا فن	بڑھاپے کی آمد اور میری تیاری	ڈاکٹر فضلِ عظیم	50
مطالعہ گاہ	میری لائبریری سے	قانتہ رابعہ	52
خفتگانِ خاک	محبت کا بہتا زم زم	ڈاکٹر خدیجہ ترابی	57
ہلکا پھلکا	اک ستم اور مری جاں	آسیہ راشد	64
روداد	وہ تین دن	محمد صفدر بشیر	66
محشرِ خیال	غزالہ ارشد، فرحت طاہر، رمانہ عمر، ارم آصف		72
غذا و صحت	پلاسٹک کا زہر	ام ارقم	76
گوشۂ تسنیم	محبت کے رنگ	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	78
منتخب کالم	ہوئے تم دوست جس کے	اوریا مقبول جان	80

ابتدا تیرے نام سے

قارئینِ کرام! یہ مہینہ بھی جاتے جاتے ایک بڑا سانحہ دے گیا۔ شکار پور کی امام بارگاہ میں بم بلاسٹ سے بچوں اور بڑوں پر مشتمل ساٹھ کے قریب معصوم جانیں چلی گئیں۔ نمازِ جمعہ کا اتنا بڑا اجتماع جس میں ایک ہزار کے لگ بھگ نمازی موجود تھے، کسی قسم کی سیکیورٹی سے محروم تھا۔ ابھی تو سانحہِ پشاور کو ڈیڑھ ماہ بھی نہیں گزرا کہ ہم پھر اتنی بڑی دہشت گردی کا شکار ہو گئے۔ جو لوگ اس ملک و قوم کی جان و مال کے امین بنائے گئے ہیں، رسمی بیانات اور خالی دعووں کے سوا ان سے کچھ امید نہیں۔ قیامت برپا ہو جائے، کسی وزیر با تدبیر کی کرسی نہیں ہلتی۔ ہر کوئی اطمینان سے بیٹھا معصوم لوگوں کو لہو دیتے دیکھ رہا ہے۔ سب سے زیادہ قیمتی جانیں انہی کی ٹھہریں جو وسائل پر قابض ہو کر بیٹھے گھروں کے لٹنے کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ ساری سیکیورٹی انہی کے لیے وقف ہے اور عوام ہمیشہ سے زیادہ غیر محفوظ۔ پٹرول کے بحران نے الگ حکومت کی بے تدبیری کو آشکار کیا۔ یوں لگنے لگا ہے جیسے کوئی والی وارث نہیں، یتیم اولاد کی طرح! شاہنواز زیدی کے الفاظ میں:

خطرہ گھر تک آ پہنچا ہے — پانی سر تک آ پہنچا ہے
خوفِ خدا کم ہوتے ہوتے — خوفِ بشر تک آ پہنچا ہے
جینے سے آسان ہے مرنا — ظلم کدھر تک آ پہنچا ہے
سب اٹھتا جاتا ہے بھروسہ — شک اندر تک آ پہنچا ہے
خالی سینہ ہونک رہا ہے — دل باہر تک آ پہنچا ہے
سورج کے ہمراہ اندھیرا — طاقِ سحر تک آ پہنچا ہے

امریکی صحافی ویبسٹر ٹارپلے نے ایک انٹرویو میں بلیک واٹر کو سانحہِ پشاور کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے اسے پاکستان کو کمزور کرنے کے امریکی ایجنڈے کا حصہ قرار دیا ہے۔ خطے میں امریکہ کے عزائم اس کے عالمی مقاصد کا ایک اہم حصہ ہیں اور اس وقت جس دہشت گردی کی بلا نے ہماری زندگیاں تنگ کر رکھی ہیں یہ اس امریکی مقاصد کی منحوس جنگ کا حصہ بننے کا ہی نتیجہ ہے۔ اللہ اس دامِ فریب سے ہمیں نکالنے کا سبب پیدا کرے جس نے ہمیں اتنے رنج والم دیے ہیں اور اتنے گھروں میں اندھیرا بھرا ہے۔ ہمارے فوجی جوان بھی اس جنگ میں بے دریغ جھونکے جا رہے ہیں اس کے باوجود عوام دن بدن پہلے سے زیادہ غیر محفوظ ہو رہے ہیں۔ جذبہِ جہاد سے سرشار یہ ہماری فوج وہ ہے جسے شکست دینے کا دشمن خواب ہی دیکھ سکتا تھا۔ اسی لیے ۱۹۷۱ میں سازشی عناصر کی مدد سے دھوکہ دہی کے ذریعے اسے نیچا دکھانے کی حسرت پوری کی گئی۔ ملک دشمن عناصر کی جانب سے پاک فوج کو آج بھی ایسی ہی صورتحال کا سامنا ہے۔ امریکی اور اسرائیلی خفیہ تنظیموں کے علاوہ بھارتی ایجنسیوں کے ملوث ہونے کے ثبوت موجود ہیں جو آرمی چیف نے امریکہ کے سامنے بھی رکھے ہیں۔ ایک طرف یہ ناقابلِ تردید حقائق ہیں اور دوسری طرف میڈیا کے ذریعے ایک گھڑی گھڑائی کہانی سنا کر کئی سالوں سے عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اللہ ہمیں ایسے حکمران دے جو قومی سلامتی کے اہم فیصلے اپنی ترجیحات کی بنیاد پر اور قومی مفادات کے مطابق کرنے کی جرأت رکھتے ہوں آمین۔

فرانسیسی اخبار کی جہالت ورذالت نے عالم اسلام کوایک بار پھر شدید مضطرب کر دیا۔شمعِ رسالت کے پروانوں نے پاکستان سمیت ہر خطے میں پر امن احتجاج کے ذریعے غم وغصے کا اظہار کیا۔مگر اس بار زیادہ تشویش ناک بات یہ ہے کہ مغربی ممالک میں مسلمان شدید قسم کے تعصب،عدم برداشت اور اسلاموفوبیا کا شکار ہورہے ہیں۔ہر مسلمان خواہ وہ کتنا ہی اچھا اور قانون پسند شہری کیوں نہ ہو،نظامِ مغرب کا وفادار اور معترف ہو،اس کی ملک اور نظام سے وفاداری پر شک کیا جارہا ہے۔آزادیِ اظہار کے نام پر شرمناک بداخلاقی روا رکھنے کے بعد ہر مسلمان سے یہ توقع کی جارہی ہے کہ وہ اس بداخلاقی کی حمایت کرے ورنہ اس کو دہشت گرد سمجھا جائے گا۔فرانس میں دوسرے گریڈ کے آٹھ سالہ مسلمان بچے کو پولیس کے حوالے کرنے کا واقعہ ایک قوم کے اجتماعی ہسٹیریا کی نشانی ہے۔مگر دکھ یہ ہے کہ اہلِ مغرب کے اس شرمناک رویے کے باوجود،جس پر پوپ نے بھی مذمت کی،خود مسلمان کسی مشترکہ عالمی فورم سے موثر آواز بلند نہیں کر سکے۔یہ ایسا واقعہ ہے جس کے بعد ضروری ہوگیا ہے کہ مسلمان ممالک دباؤ ڈالیں کہ اقوام متحدہ انبیا کی شان میں گستاخی پر قانون سازی کرے،حرمت انبیا کا قانون بنائے اور کسی کے مذہبی جذبات مجروح کرنے کو جرم قرار دے۔انبیا کی لائی ہوئی تعلیمات انسانیت کا مشترکہ ورثہ ہیں،ان کا احترام سب پر لازم ہے۔

ہو لاکھ آفتابِ قیامت کی دھوپ تیز
میرے لیے تو سایہِ دیوار آپ ﷺ ہیں
یہ فخر کم نہیں کہ میں ہوں جس کی گردِ رہ
اس قافلے کے قافلہ سالار آپ ﷺ ہیں
انسان مال و زر کے جنوں میں ہیں مبتلا
اس حشر میں ندیمؔ کو درکار آپ ﷺ ہیں

۵فروری کا دن اہلِ کشمیر کی قربانیوں کو یاد رکھنے اور بھارت کے پنجہِ استبداد سے آزادی دلانے کے عزم کے ساتھ منایا جاتا ہے۔کشمیر ہماری شہ رگ ہے اور کشمیریوں کا حقِ خودارادیت ہمارا اصولی موقف ہے۔حکومتوں کی مجبوریاں جو بھی ہوں،اہلِ پاکستان کے دل اپنے کشمیری بہن بھائیوں کے ساتھ دھڑکتے ہیں۔اللہ وہ دن جلد دکھائے جب کشمیر غاصبوں کے پنجے سے آزاد ہو۔پاکستان میں کشمیر کاز کے علمبردار اور سکالر محترم الیف الدین ترابی انتقال کر گئے۔اللہ ان کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے اور اپنے ہاں بہترین مقام سے نوازے آمین۔

جاتے ہوئے سال کے آخر میں اہلِ غزہ پر پھر قیامت توڑی گئی اور ایک ماہ میں دو ہزار فلسطینیوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔دنیا مہر بلب تماش بین رہی۔عرب ممالک بدستور بے حسی کی تصویر بنے رہے اور امت کے بچوں اور جوانوں کا خون خاک میں ملتا رہا۔اللہ امت کے حال پر رحم فرمائے،آزمائشوں کو دور کرے اور ہمیں اپنی جگہ اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی توفیق دے آمین۔

دعا گو:

صائمہ اسما

حمیرا خالد

جادو کی حقیقت

لغت میں سحر ہر ایسے اثر کو کہتے ہیں جس کا سبب دکھائی نہ دیتا ہو، جیسے مقناطیس کی کشش جو نظروں سے پوشیدہ ہوتی ہے اور لوہے کو لوہے سے جوڑ دیتی ہے۔ عرف عام میں جادو (سحر) ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جن میں جنات و شیاطین کا عمل دخل ہو۔ مگر جادو کی اقسام بہت ہیں۔ جنات شیاطین کی مدد کے بغیر بھی قوت خیالیہ کو متاثر کر کے جس کو سائنس نے مسمریزم یا ٹیلی پیتھی جیسے نام دیئے ہیں، ان سے دماغ پر وہ اثر ڈالے جاتے ہیں کہ جسے آنکھ دیکھتی ہے اور جسم محسوس کرتا ہے مگر حقیقت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ فرعون کے دربار میں جس سحر کا مظاہرہ کیا گیا تھا وہ اسی قسم کا سحر تھا۔

سحروا اعین الناسہ (انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کیا)

یخیل الیہ من سحرھم انّھا تسعیٰہ (ان کے سحر سے موسیٰ علیہ السلام کو خیال ہوا کہ یہ رسیوں کے سانپ ہیں جو دوڑ رہے ہیں)

جادو کی ایک قسم یہ بھی ہے جس میں شعبدہ باز اپنے اعضاء کی چالاکی سے ایسے کام کرتے ہیں جو حقیقت میں نہیں ہوتے مگر دیکھنے والے کی نظر اس سے دھوکا کھا جاتی ہے یہ شعبدہ باز ایسے الفاظ کی تکرار اور جسم کی حرکات کے مخصوص انداز سے خیالات و نظریات پر عارضی طور پر قابو حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ بھی محض نظر فریبی ہے کیونکہ اس سے بھی چیز کی حقیقت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی بلکہ آدمی نفسیاتی مریض بن جاتا ہے اور اپنے آپ کو بیمار مان کر ہر ہر بیماری کی علامات اپنے اندر محسوس کرنے لگتا ہے۔

ایک زمانے میں بابل شہر میں جادو کا بہت چرچا تھا۔ بالخصوص یہودی قوم میں جادو ٹونے، تعویذ گنڈے کرنے کا رواج عام تھا۔ یہ لوگ انبیاء کرام کے معجزات اور جادو کی کرامات کو خلط ملط کرنے لگے تھے۔ بعض لوگ تو جادوگروں کے جادو کے عجیب و غریب اثرات دیکھ کر اسے نیک کام سمجھنے لگے تھے۔ بلکہ جادوگروں کو مقدس اور جادو کو فن سمجھ کر سیکھنے کی کوشش کیا کرتے۔ لہٰذا بابل میں جادوگری کا فن انتہائی عروج پہ تھا۔ ملک میں لاکھوں کی تعداد میں جادوگر موجود تھے۔ اس فن کی بنیاد پر انہیں معاشرہ میں اونچے مناصب اور برتری حاصل ہوتی۔

اللہ تعالیٰ نے اس اشتباہ اور غلطی کو دور کرنے کیلئے بابل میں دو فرشتے ہاروت و ماروت بھیجے۔ یہ لوگوں کو سحر کی حقیقت بتاتے اس علم سے آگاہی دیتے تاکہ اشتباہ بھی جاتا رہے۔ اور لوگ جادو کرنے اور جادوگری کے فریب سے بچ سکیں۔

لیکن جو قوم بے راہ روی اور بے عملی کی راہ پر چل نکلے، محنت سے گریز کرتی ہو اور جو منتر جیسی چیزوں سے مسائل حل کرنا چاہے تو ساحر، کہانت اور عملیات کرنے والوں کی خوب چاندی ہوتی ہے وہ وظائف تعویزوں کے طلسماتی اثرات سے لوگوں کو گرویدہ بنا لیتے ہیں اور فریب کے جال میں پھانس لیتے کہ جس کے بعد انہیں وہی کچھ محسوس ہوتا جو وہ محسوس کروانا چاہتے اور وہی دکھائی دیتا جس انداز سے وہ ان کو دکھانا چاہتے۔ یہ جادوگر اپنے جادو کی نسبت حضرت سلیمان علیہ السلام سے کیا کرتے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جنوں اور ہواؤں پر جو غیر معمولی اقتدار حاصل تھا وہ سب علم سحر کی بنا پر تھا اور یہ علم اصل میں انہی جنوں کے ذریعے سے ان کو حاصل ہوا ان کی دانست میں جادو وہ مقدس قوت ہے جس کی مدد سے مخلوق کو حسب خواہش تسخیر کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جس طرح لوطؑ کی قوم میں تنبیہہ کیلئے خوبصورت لڑکوں کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے فرشتے آئے تھے۔ اسی طرح یہود کی آزمائش اور ہدایت کیلئے اللہ تعالیٰ کے دو فرشتے اس علم کے ساتھ آئے جو وہ یہ خبردار کرتے جاتے

تھے کہ یہ تمہارا امتحان ہے اس میں تمہارے لئے خسارہ ہے۔ وہ لوگوں کو اس کے نتائج بد سے بھی پوری طرح آگاہ کر دیا کرتے۔ ''دیکھو یہ کلمات بچنے کے لائق ہیں ان سے احتیاط کرنا۔ دیکھو یہ آزمائش ہے کہ ہمارے بتانے سے اپنا دین خراب ہونے کون بچاتا ہے۔ اور کون مطلع ہونے کے باوجود اس شر کو اختیار کرتا ہے یا عمل میں لاتا ہے۔''

وہ بتاتے کہ یہ کفر ہے خواہ عملی ہو یا اعتقادی۔ اس انتباہ کے باوجود لوگ ان پر ٹوٹ پڑے وہ یہ فن اس لئے جاننا چاہتے ہیں کہ اس کی خرابی سے خود کو اور دوسروں کو بچا سکیں لیکن اصل میں انہوں نے اس کو ناجائز مقاصد میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ حالانکہ ناجائز مقصد کیلئے یا کسی کو نقصان پہنچانے کیلئے قرآن و حدیث کے کلمات سے بھی کام لینا جائز نہیں۔ خواہ وہ وظیفہ اسماء الہیہ ہو یا قرآنی آیات کا تعویذ ہو۔

قرآن و حدیث نے سحر کو کفر کہا ہے وہ ایسا عمل ہے جس میں کفر و شرک اور فسق و فجور کے شیاطین جنات کو خوش کیا گیا ہو اور ان سے مدد لی گئی ہو۔ جس طرح طہارت پاکی خوشبو اور ذکر اللہ سے فرشتوں کی قربت حاصل ہوتی ہے اسی طرح شیاطین جنات کی مدد لینے کیلئے ان تمام کاموں کو اختیار ہوتا ہے جو گندے، ناپاک، نجس، بدبودار اور حرام ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ساحر کو اللہ کے سوا دوسروں کی پرستش کر کے ان شیاطین کو راضی کرنا ہوتا ہے۔ عموماً جادو کرنے والے نجوم، کواکب یا آگ کی پرستش کا عقیدہ رکھتے ہیں ان کے نزدیک علم نجوم اور علم کواکب نفع نقصان پہنچانے کا اختیار رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس ذریعے قسمتوں یا تقدیر پر بھی اثر انداز ہوا جا سکتا ہے۔ غیب کی حقیقتیں کھولی جا سکتی ہیں اور مستقبل کے حالات کی خبر دی جا سکتی ہے۔

تعویذ گنڈے جو عامل فقیرانہ بھیس میں کیا کرتے ہیں اکثر اوقات وہ انہی شیاطین جنات سے مدد لیتے ہیں۔ اور ایسا کرنے کیلئے وہ شیاطین جنات کے ہر حکم کے آگے سر تسلیم خم کیا کرتے ہیں۔ خواہ وہ قطعی حرام ہی کیوں نہ ہو، جیسے کسی کا ناحق خون بہانا، جنابت یا نجاست کی حالت میں رہنا۔ طہارت اور پاکی سے اجتناب کرنا یہی وجہ ہے کہ جادو ٹونے کے اثرات ان لوگوں پر زیادہ کامیاب ہوتے ہیں جو اللہ کے ذکر اور عمل صالح سے غافل رہتے ہوں۔ نجاست اور ناپاکی سے بچاؤ نہیں کرتے۔ خبیث کاموں کے عادی ہوں۔

قرآن کہتا ہے: ''میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کن لوگوں پر شیطان اترتے ہیں۔ ہر بہتان باندھنے والے گناہگار پر۔''

هَلْ انبُّكم عَلٰى مَنْ تَنزّلُ الشياطِينُ تنزلُ عَلٰى كلِّ افّاكٍ اثِيمٍ

مشیئت الٰہی کے بغیر سحر بے اثر ہے

اسلامی فکر کا قاعدہ اور کلیہ یہ ہے کہ اللہ کے حکم سے اسباب میں اثر پیدا ہوتا ہے۔ اور اللہ جب چاہے۔ چیزوں کی خاصیت بدل دے۔ آگ اللہ کے حکم سے جلانے کے بجائے ٹھنڈی ہو سکتی ہے۔ پانی پیاس بجھانے کے بجائے طوق پیدا کر سکتا ہے۔ خدا کے حکم سے ہر چیز اپنی خاصیت ترک کر سکتی ہے۔ بالکل اسی طرح اللہ اس بات پر قادر ہے کہ جادو کی اس خاصیت سے اپنی خاص حکمت کے تحت نقصان کا اذن نہ دے۔

وماهُمْ بضَارّينَ بِهِ مِنْ اَحَدٍ الّا باذْنِ اللّٰه.

اللہ کے اذن کے بغیر وہ ان عملیات سے کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ گویا جادو کا مؤثر ہونا اللہ کے اذن کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ جادو کا اثر صرف ذات محمدؐ پر ہوا تھا نبوت محمدؐ اس سے بالکل غیر متاثر رہی۔ روایات کی رو سے آپؐ پر جو جادو کیا گیا تھا اس کے اثر سے آپ مضمحل اور بیمار ہو گئے تھے اور پھر اس اثر کو دور کرنے کیلئے جبرائیل علیہ السلام نے آپ کو معوذتین پڑھنے کی ہدایت کی تھی۔

مولانا مودودی رحمتہ اللہ (تفہیم القرآن حصہ) کہتے ہیں کہ جادو دراصل ایک نفسیاتی اثر ہے جو نفس سے گزر کر جسم کو بھی اسی طرح متاثر کر سکتا ہے جس طرح جسمانی اثرات جسم سے گزر کر نفس کو متاثر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر خوف ایک نفسیاتی چیز ہے جس کا اثر جسم پر یہ ہوتا ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بدن میں تھرتھری چھوٹ جاتی ہے دراصل جادو سے حقیقت تبدیل نہیں ہوتی مگر انسان کا نفس اور اس کے

حواس اس سے متاثر ہو کر یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ حقیقت تبدیل ہو گئی ہے۔

کیا جھاڑ پھونک سے علاج کریں

حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا کہ میری امت کے وہ لوگ بلاحساب جنت میں داخل ہوں گے جو نہ داغنے کا علاج کرتے ہیں نہ جھاڑ پھونک کراتے ہیں۔ نہ فال لیتے ہیں بلکہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔ (مسلم)

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں حضورؐ نے جھاڑ پھونک سے بالکل منع فرما دیا تھا لیکن بعد میں اس شرط کے ساتھ اجازت دے دی کہ اس میں شرک نہ ہو۔ اللہ کے پاک ناموں یا اس کے کلام سے جھاڑا جائے۔ کلام ایسا ہو جو سمجھ میں آئے اور یہ معلوم کیا جا سکے کہ اس میں کوئی گناہ کی چیز تو نہیں ہے اور بھروسہ جھاڑ پھونک پر نہ کیا جائے بلکہ اللہ پر اعتماد کیا جائے وہ چاہے گا تو اسے نافع بنا دے گا۔

یاد رہے کہ معوذتین وہ انعام الٰہی ہے جس کی مدد سے ہر طرح کی مخلوق کے فتنے اور شر سے محفوظ رہنے کیلئے پناہ مانگی گئی ہے۔ راہ راست کی پیروی میں سب سے زیادہ یہی شیاطین جن وانس رکاوٹ بنتے ہیں۔ لہٰذا نبی کریمﷺ نے تاکید فرمائی۔ ''**یا اباذر تعوّذباللہ من شر شیاطین الانس و الجن**'' اے ابوذر! شیاطین انس اور شیاطین جن کے شر سے اللہ کے پناہ مانگو''

اللّٰھُمَّ نَجنَّا مِنھُم

☆.....☆.....☆

نعیم صدیقی

انقلابی کلمۂ حق

بے سروسامانی کے عالم میں ہجرت کرتے ہوئے جو نگاہ سراقہ کے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن دیکھ لیتی ہے، کیا اسے اپنی دعوت کے منتہا اور اپنے تمدنی نصب العین کا پتہ نہ تھا؟ ''محسنِ انسانیت'' کا ایک باب

پیغمبر انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی اعتقاد، کسی نظریہ اور کسی نقشۂ فکر کے بغیر اصلاح وتعمیر کا کام یونہی شروع نہیں کر دیا۔ محض ایک مبہم جذبہ نہ تھا، کوئی جنون خام نہ تھا، بلکہ حضورؐ کون ومکان کی عظیم ترین سچائی کی مشعل لے کے اٹھے۔ انتہائی حساس قلب کے ساتھ برسوں حضورؐ نے زندگی کے معمے پر کاوشیں کی تھیں، غار حرا کی خلوتوں میں مدتوں اپنے اندرون کا بھی مطالعہ کیا اور بیرونی عالم پر بھی غور کیا۔ تمدن کے صلاح وفساد کے اصولوں کو سمجھنے میں بھی دماغ کھپایا۔ لیکن عملی اقدام اس وقت تک نہیں کیا جب تک کہ علم الٰہی نے آپؐ کے قلب کو حقیقت سے منور نہیں کر دیا۔ اور سب سے بڑی سچائی پوری طرح آپ کے سامنے بے نقاب نہیں ہوگئی۔ سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ کائنات کا ایک خدا ہے اور انسان اس کا بندہ ہے! یہی کلمہ حق حضورؐ کے انقلاب کا بیج تھا۔ اس بیج سے صالح زندگی اور صحت مند تمدن کا وہ شجرۂ طیبہ نمودار ہوسکتا تھا۔ جس کی شان یہ ہے کہ اس کی جڑیں زمین میں گہری اتری ہوئی ہیں اور اس کی شاخیں فضا کی بلندیوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔

حضورؐ کا کلمہ حد درجہ کا انقلابی کلمہ تھا۔ ''لا الہ الا اللہ!'' لفظی پہلو سے انتہائی مختصر، معنوی لحاظ سے بے حد عمیق۔ ''ایک اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ صرف وہی ایک الٰہ ہے۔'' الٰہ اس طاقت یا ہستی کو کہتے ہیں جس کی غلامی کی جائے، جس پر آدمی والہانہ طور پر فدا ہو۔ جس کی عظمت مان کر پرستش کرے۔ جس کی تحمید وتقدیس کرے۔ جس کے گن گائے۔ جس کی تسبیح کرے۔ جس کو نذر پیش کرے، جس سے بھلائی کی امیدیں لگائے اور جس کی گرفت سے ڈرے۔ جس سے نیکی کی جزا کا امیدوار ہو اور جس سے برائی کی سزا کا اندیشہ رہے۔ جس کو اپنا مالک ومختار سمجھے، جس کو فرمانروا اور قانون ساز مانے، جس کے مطالبوں کو پورا کرے۔ اور جس کے منع کردہ امور سے باز رہے۔ جس کے دیئے ہوئے اصولوں کو بناء زندگی بنائے۔ جس کی مقررہ حدوں کی پابندی کرے۔ جس کے ضابطہ حلال وحرام کو بے چون و چرا مانے، جس کو اپنے لیے سرچشمہ ہدایت تسلیم کرے، جس کی مرضی کے مطابق نظام حیات کی تشکیل کرے۔ جس کے پسندیدہ لوگوں کا احترام کرے اور جس کے مخالفوں کی مخالفت کرے۔ جس کے اشاروں پر تن من دھن کی بازی لگا دے اور جس کی رضا کو زندگی کا نصب العین قرار دے۔ الوہیت کا یہ وہ وسیع مفہوم تھا جو ایک لفظ میں پنہاں تھا۔

الوہیت کے یہ حقوق خدائے واحد سے الگ کر کے بہت سی انسانی طاقتوں نے پارہ پارہ کر کے بانٹ رکھے تھے۔ اور بے شمار الٰہ تمدن پر سوار تھے۔ انسان کا اپنا نفس اور اس کی خواہشیں، خاندان اور برادری کی رسمیں، نسلی، قومی اور قبیلوی وحدتوں کی روایات، جاگیردار اور پجاری طبقوں کی بالادستی، شاہی خاندانوں اور درباری اشراف کی کبر پسندی، یہ مختلف طبق برطبق الوہیتیں تھیں۔ جن کے نیچے عام آدمی پس رہا تھا۔ ''لا الہ الا اللہ'' کی شاہ ضرب ان سب پر یک دم پڑتی تھی۔ اس کلمہ کا کہنے والا گویا یہ اعلان کرتا تھا کہ خدا کے سوا کسی کی عظمت مجھے تسلیم نہیں، کسی کی بالادستی قبول نہیں، کسی کا بنایا ہوا ضابطہ وقانون منظور نہیں، کسی کے حاصل کردہ فوق الانسانی حقوق جائز نہیں، کسی کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا جائے گا۔ کسی کی رضا جوئی اب نہ کی جائے گی اور کسی کے اشارہ

ابرو پر اب زندگی کا نظام نہیں چلے گا، خدا کے سوا ہر دوسری خدائی توڑ دی جائے گی۔ یہ کلمہ گویا انسان کی سچی آزادی کا اعلان تھا۔

لا الہ ضرب است وضربِ کاری است

اس کلمہ کے دوسرے جز میں یہ اقرار شامل تھا کہ انسانی ہدایت اور تمدن کی اصلاح کیلئے واحد ذریعہ وہ سلسلہ نبوت و رسالت ہے جو اللہ نے قائم کیا ہے، زندگی کا اصل علم وہ ہے جو وحی کے ذریعے آیا ہے اور اسی سے عقل انسانی کو سوچنے کیلئے رہنما اصول ملتے ہیں۔ پھر یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سلسلہ رسالت کی تکمیل فرمانے والے ہیں اور اب زندگی کی رہنمائی اسی ہستی کے واسطے سے حاصل ہوسکتی ہے اور اسی ہستی کی قیادت میں قافلہ انسانیت فلاح وارتقاء کی راہ پر گامزن ہوسکتا ہے۔

اس کلمے کی یہی اہمیت تھی کہ جس کی وجہ سے اس کا اقرار اسلام میں داخلہ کی شرط اول ٹھہرا۔ اس کلمے کو موذنوں نے بلند آواز سے پکارا، اس کلمے کو نماز میں شامل کیا گیا اسے افضل الذکر قرار دیا گیا۔ اور ہر لحاظ سے یہ کلمہ تحریک اسلامی کا طغریٰ یا سلوگن بن گیا۔

حضورؐ کا انقلابی کلمہ حق جس دل میں اترا اس کی کایا پلٹ دی، جس زندگی میں داخل ہوا اس کا نقشہ بدل دیا اور اس بیج سے نئی انسانیت پیدا ہوئی اور نشوونما پانے لگی۔

اصلاح تمدن کیلئے حضورؐ کا نصب العین:

سیرت پاکؐ سے صحیح استفادہ کرنے کیلئے اس اہم سوال کا جواب ضرور سامنے ہونا چاہیے کہ حضورؐ کے پیش نظر تبدیلی کا دائرہ اور کام کا پیمانہ کیا تھا؟ تمدنی نظام میں حضورؐ کوئی جزوی اصلاح چاہتے تھے یا ہمہ گیر؟ دعوت مذہبی واخلاقی تھی یا وہ سیاسی اہمیت بھی رکھتی تھی؟ بالفاظ دیگر تمدنی دائرہ میں نصب العین کیا تھا؟

اس سوال کا جواب خود قرآن کریم میں بڑی وضاحت سے موجود ہے اور مختلف پیرایوں میں تکرار سے اسلامی دعوت کا مدعا واضح کیا گیا ہے۔ یہاں ہم صرف دو آیات کو لیتے ہیں۔ ایک مقام پر جملہ انبیاء و رسل کی بعثت کا مقصود یوں بیان کیا ہے:

ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلائل دے کر جس مقصد کیلئے بھیجا ہے اور جس غرض کے لیے بھیجا ہے اور جس غرض کیلئے ان پر کتابیں نازل کی ہیں اور ان کو ضابطہ حق کی میزان عطا کی ہے وہ یہ ہے کہ لوگ انصاف پر قائم ہو جائیں اور لوہا اتارا جس سے ہتھیار بنتے ہیں اور اس میں لوگوں کیلئے اور بھی فوائد ہیں۔ (الحدید۔۲۵)

بات نہایت ہی صاف ہے کہ دعوت حق کا منشا انسانی زندگی کو نظام قسط کے سانچے میں ڈھالنا اور تمدن میں عملاً عدل وتوازن پیدا کرنا ہے۔ اس آیت میں متصلاً آہنی اسلحہ کو بھی اسی مقصد کیلئے استعمال کرنے کا اشارہ موجود ہے۔ یعنی نظام حق کی اقامت، اس کے تحفظ اور اس کے فروغ کیلئے سیاسی اور فوجی قوت بھی ناگزیر ہے۔

خود محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی غایت اور زیادہ صراحت سے بیان کی گئی اور وہ بھی ایک سے زیادہ بار بیان کی گئی۔ ملاحظہ ہو:

وہی (اللہ) ہے جس نے اپنے رسولﷺ کو ضابطہ ہدایت اور دین حق دے کر اس غرض سے بھیجا ہے کہ وہ ہر دین کے مقابلے میں اسے (پوری انسانی زندگی پر) غالب کر دے! اگرچہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو!

مدعا یہ کہ قریش اور عرب کے دوسرے مشرکین تو اپنے جاہلی نظام حیات کو برقرار رکھنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں گے۔ اور جاہلیت کے خلاف جو آواز اٹھے گی وہ انہیں سخت ناگوار ہو گی۔ مگر ان کی ناگواریوں کی پروا کیے بغیر ان کے محاذ مخالفت کو توڑ کر حضورﷺ کو اقامت دین کرنا ہے اور خدا کے ضابطہ ہدایت کو عملاً جاری کرنا ہے۔ یہ مدعا اگر دعوت حق میں مضمر نہ ہوتا تو کشمکش اور جہاد اور ہجرت کے ابواب کہاں سے آتے؟ جان و مال کی قربانیاں کاہے کیلئے مانگی جاتیں؟ کس مقصد کیلئے ''کونو انصار اللہ'' کی صلائے عام دی جاتی؟ کس غایت کیلئے ''حزب اللہ'' یا اللہ کی پارٹی تشکیل پاتی کس نصب العین کے لیے شہداء چنے جاتے؟ قرآن اور سیرت دونوں کا فہم دعوت حق کے منتہا کو ذہن نشین کئے بغیر ممکن نہیں رہتا۔

آیئے اب ہم خود حضورؐ کے ابواب سیرت کا مطالعہ کر کے اس نصب العین کا سراغ لگائیں، جو پیش نظر تھا!

حضورؐ نے بالکل ابتدائی مرحلے میں خاندان بنی ہاشم کی ایک ضیافت اپنا پیغام سنانے کیلئے منعقد کی تھی۔اس میں اجمالاً بیان فرمایا تھا کہ یہ دعوت دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی ضامن ہوگی۔ بہت عرصہ بعد قریش کے ایک وفد سے گفتگو کرتے ہوئے اسی بات کو دہرایا اور فرمایا:

تم اگر میری وہ دعوت قبول کرلو، جسے میں پیش کررہا ہوں تو اس میں تمہاری دنیا اور آخرت دونوں کی بہتری ہے۔

دنیا کی بہتری اور بھلائی کے سادہ الفاظ سے کسی جزوی بھلائی کو مراد لینا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ جزوی بھلائی تو ہر دعوت میں موجود ہوتی ہے اور ہر نظام شر میں بھی کچھ اچھے پہلو ہوتے ہیں۔مطلب زندگی کا سنور جانا اور تمدن کا درست ہوجانا، نظام قسط کا قائم ہوجانا اور حیات طیبہ کا حاصل ہوجانا ہے۔

پھر ابتدائی دور کشمکش میں ایک اور موقع پر حضورؐ سے گفت وشنید ہوتی ہے تو اس کے دوران میں آپؐ فرماتے ہیں:

بس وہ ایک کلمہ، اسے اگر مجھ سے قبول کرلو۔تو اس کے ذریعے تم سارے عرب کو زیرنگین کرلوگے اور سارا عجم تمہارے پیچھے چلے گا۔

میلوں اور حج کے موقعوں پر قبائل کے کیمپوں میں جاجا کر حضورؐ نے یہی بات ہر سردار قبیلہ سے کہی۔فرماتے مجھے ساتھ لے چلو، مجھے کام کرنے کا موقع دو، اور مجھ سے تعاون کرو یہاں تک کہ خدا کی طرف سے اس پیغام کو میں واضح کردوں جس کیلئے مجھے مبعوث کیا گیا ہے چنانچہ بنو عامر کا سردار بحیرہ بن فراس حضورﷺ کے پیغام، حضورؐ کی شخصیت اور حضورؐ کی والہانہ سرگرمی کار سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے کہا کہ اگر یہ نوجوان میرے ہاتھ آجائے تو میں سارے عرب کو نگل جاؤں۔اس کی نگاہیں حضورﷺ کی دعوت کے منتہا اور کام کے نتائج تک پہنچ گئیں۔اور اسی لیے اس نے ایک سودا گانٹھنا چاہا۔حضورؐ کو وہ اپنا تعاون اس قیمت پر پیش کرتا ہے کہ جب آپﷺ کو مخالفین پر غلبہ حاصل ہوجائے، تو آپؐ کے بعد اقتدار ہمیں حاصل ہو، ماننا پڑتا ہے کہ بحیرہ کی نگاہ بڑی دوررس تھی۔اب اگر حضورﷺ محدود مذہبی تصور کے محض واعظ اور مبلغ ہوتے اور کوئی سیاسی منتہا آپؐ کے سامنے سرے سے نہ ہوتا تو صاف صاف کہہ دیتے کہ بھائی میں تو ایک اللہ والا ہوں، مجھے اقتدار کے بکھیڑے سے کیا مطلب اور میرے کام میں حکومت اور قیادت کا کیا سوال!......

مگر حضورؐ کا جواب یہ نہ تھا، حضور نے یہ فرمایا: ''**الا مر الی الله، یضعه حیث یشاء**'' اقتدار کا معاملہ خدا کے اختیار میں ہے۔اور وہ جس کے قبضے میں چاہے گا رکھے گا اور سودا چکانے سے انکار کردیا۔

حضورؐ کی دعوت کے سلسلے میں ''عرب وعجم کے اقتدار'' کا چرچا اتنا عام ہوگیا تھا، جیسے تحریک اسلامی کا طغریٰ (سلوگن) ہو۔ بچے بچے کی زبان پر یہ بات رہتی تھی، حتیٰ کہ مخالفین نے اسی کو بناء طنز بنالیا تھا، اسلام کے سائے میں جو غلام اور غریب طبقوں کے نوجوان آکے جمع ہورہے تھے اور جن کو قریش تشدد کے کولہو میں پیل رہے تھے ان کو دیکھتے تو اشارے کرکے طنزاً کہتے کہ واہ کیا کہنے ہیں ان ہستیوں کے، یہ ہیں جو عرب وعجم کے حکمران اور سردار بننے والے ہیں۔

طنز وتمسخر اور مخالفت ومزاحمت کے سارے طوفان اٹھانے کے باوجود قریش کے سمجھ دار لوگ دلوں کی گہرائیوں میں یہ ضرور محسوس کرتے تھے کہ یہ دعوت کوئی معمولی چیز نہیں بلکہ اس سے بڑے بھاری نتائج پیدا ہونے والے ہیں۔ایک مرتبہ عتبہ کو سرداران مکہ نے حضورؐ سے گفت وشنید کیلئے بھیجا، عتبہ نے حکومت، مال و دولت اور دنیوی مفاد کی ہر ممکن پیش کش حضورؐ کے سامنے بیان کی کہ کسی طرح آپؐ اس انقلابی مہم سے باز آجائیں۔حضورؐ نے جواب میں سورۃ حم السجدہ کی آیات سنائیں۔عتبہ جو تاثر اس مجلس سے لے کر گیا۔اس نے اس کے چہرے کا رنگ بدل دیا تھا۔اس نے جاکر کہا، کہ اس دعوت میں تو ایک ''نباءِ عظیم'' مضمر ہے۔یعنی ایک بہت بڑی تبدیلی کی حامل ہے کوئی انقلاب آنیوالا ہے اور زندگی کا نقشہ زیروزبر ہوجائیگا۔اس لیے اس نے مشورہ دیا کہ محمدؐ کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔تم درمیان میں حائل نہ ہو، اگر اہل عرب نے اس شخص کا خاتمہ کردیا تو تم سستے چھوٹے اور اگر اسے غلبہ حاصل ہوگیا، تو ''**ملکه ملککم و عزه عزکم و کنتم اسعد الناس**'' اس کی سلطنت تمہاری سلطنت ہو

گی، اس کا اقتدار تمہارا اقتدار ہوگا اور تم لوگوں میں سب سے بڑھ کر معزز ہو جاؤ گے۔ یعنی عتبہ تک یہ حقیقت پا گیا کہ اس دعوت کے پردے میں ایک سلطنت چھپی ہوئی ہے اور یہ اقتدار پر منتج ہوگی۔ تو آخر خود حضورؐ اور حضورؐ کے رفقاء اس منتہا سے کیسے غافل ہو سکتے ہیں۔

ایک موقع پر جب تشدد کی بھٹی خوب گرم تھی۔ حضورؐ کے رفقاء نے اپنا دکھڑا بیان کیا اور دعا کی درخواست کی۔ حضورؐ نے پہلے تو ان کو بتایا کہ اقامت دین کی جدوجہد کی گھاٹیاں کتنی کٹھن ہوتی ہیں اور ماضی میں جن جوانوں نے یہ فرض ادا کیا ہے انہیں کیا کچھ پیش آیا اور پھر پورے وثوق سے مژدہ سنایا کہ ''خدا کی قسم! اس مہم کو اللہ تعالیٰ ضرور اس کے مرحلہ تکمیل تک پہنچائے گا'' پھر اس مرحلہ تکمیل کی کیفیت بیان کی کہ:

''ایک سوار صنعا سے حضر موت تک سفر کرے گا اور اسے اللہ کے سوا اور کسی کا ڈر نہ ہوگا۔ یعنی ایک ایسا نظام عدل اور دور رحمت چھا جانے والا ہے اور ایسا پرامن ماحول قائم ہونے والا ہے کہ آج جہاں ڈاکے پڑ رہے ہیں اور قتل ہو رہے ہیں، جہاں آدم زاد دن دہاڑے زمین سے اچک لئے جاتے ہیں۔ اور جہاں کھلم کھلا عصمتیں لٹ رہی ہیں، وہاں مسافر کل تن تنہا اس سرزمین میں بے کھٹکے سفر کرے گا۔ کسی کو اس کی جان اس کے مال اور اس کی عزت سے تعرض کرنے کی جرأت نہ ہوگی۔ ایک بار حضورؐ نے یوں بھی فرمایا کہ عنقریب وہ زمانہ آئے گا کہ مکہ کو بے نگہبان کے قافلہ جایا کرے گا۔

نصب العین کا کتنا واضح اور اجلا تصور ہے!

ایک مرتبہ عثمان بن طلحہ کلید بردار کعبہ سے حضورؐ نے کعبہ کا دروازہ کھلوانے کیلئے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ بظاہر سخت ناسازگار مایوس کن حالات کے درمیان کھڑے ہو کر اس وقت حضورؐ نے فرمایا۔ کہ ایک دن آنے والا ہے جب کہ یہ کنجی خود ہمارے ہاتھ میں ہوگی اور ہم جسے چاہیں گے تفویض کریں گے۔

عقبہ کے مقام پر انصار مدینہ سے جو تاریخی بیعتیں واقع ہوئیں ان کا مطالعہ کیجئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ انصار تک نے اس سیاسی کشمکش کی وسعتوں کو سمجھ لیا تھا جو دعوت حق کے نتیجے میں نمودار ہونے والی تھی اور جس کا فیصلہ آگے چل کر میدان جنگ میں ہونے والا تھا ایک طرف انصار حضورؐ کی حمایت میں سرخ وسیاہ سے معرکہ آرا ہونے کا پیمان باندھ رہے ہیں اور اپنے اشراف کی ہلاکت اور مالوں کی تباہی کو لبیک کہتے ہیں۔ دوسری طرف حضورؐ سے عہد لیتے ہیں، کہ جب خدا آپ ﷺ کو غلبہ عطا کر دے تو آپ ﷺ ہمیں چھوڑ کر واپس نہ چلے آئیں گے۔ جنگ، قربانیاں اور غلبہ..... کیا ان تصورات میں وہ نصب العین نمایاں اور واضح نہیں ہے جو حضورؐ کے سامنے تھا۔

ہجرت کی راہ میں قدم رکھنے سے پہلے جو دعا آپ کو سکھائی جاتی ہے اس دعا کا تکمیلی جزء یہ ہے کہ **واجعل لی من لدنک سلطنا نصیرا** حضورؐ کو خدا سے سلطان نصیر کی طلب سکھائی گئی ہے۔ یعنی مقدس مشن کی پشت پناہی کرنے کیلئے اقتدار اور فرمانروائی درکار تھی۔

جناب ابو طالب پر جب حضورؐ کی حمایت ترک کرنے کیلئے دباؤ ڈالا گیا تو انہوں نے حضورؐ سے گفتگو کی کہ میرے لئے مشکلات نہ پیدا کرو۔ اس پر حضورؐ نے وہ مشہور جواب دیا تھا کہ خواہ یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ پر آفتاب اور بائیں ہاتھ پر مہتاب کیوں نہ لا کر رکھ دیں۔ میں اپنے مشن سے باز نہیں رہ سکتا۔ حضورؐ نے اپنی بات ان الفاظ سے مکمل کی تھی کہ:

..... یہاں تک کہ یا تو اللہ تعالیٰ اس مشن کو غالب کر دے گا، یا اس میں اپنی جان کھپا دوں گا۔

یہاں لفظ **لیتمہ، نہیں لیظھرہ** استعمال فرمایا۔ جس میں کشمکش اور غلبے کا تصور شامل ہے۔ اور آگے کا جملہ بتاتا ہے کہ کشمکش بھی ایسی ہے جس میں جان جوکھوں میں ڈالنے کا معاملہ ہے۔

مدنی دور میں عدی بن حاتم حاضر ہو کر حضورؐ کی شخصیت کا جائزہ لیتا ہے۔ دعوت کی نوعیت سمجھنا چاہتا ہے۔ ناقدانہ نگاہ سے حضورؐ کے اطوار کی جانچ کرتا ہے اور دل میں متاثر ہوتا ہے۔ اس کے طرز فکر کا لحاظ کرتے ہوئے حضورؐ اس سے گفتگو کرتے ہوئے جہاں یہ بتاتے ہیں کہ عنقریب بابل کے سفید محلات اسلام کے تسلط میں ہوں گے، عنقریب یہاں دولت کی ریل پیل ہوگی اور عنقریب مسلمانوں کی عددی قوت بہت ہی

بڑی ہو گی، وہاں اسے اسلامی نظام عدل کی اس شان سے بھی آگاہ کرتے ہیں کہ عنقریب تم دیکھو گے کہ ایک عورت قادسیہ سے اونٹ پر تن تنہا اس مسجد تک آنے کیلئے نکلی اور خیر و عافیت سے پہنچی۔

بظاہر بے سروسامانی کے عالم میں سفر ہجرت کرتے ہوئے جو نگاہ سراقہ کے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن دیکھ لیتی ہے، کیسے یہ کہتے ہو کہ اسے اپنی دعوت کے منتہا اور اپنے تمدنی نصب العین کا پتہ نہ تھا! کیسے یہ سوچتے ہو کہ اسلامی ریاست بطور مقصد کے پیش نظر نہ تھی۔ اس کے لیے تیاریاں نہیں کی گئیں، اس کے لیے جدوجہد عمل میں نہیں آئی اور وہ اچانک بطور انعام حضورؐ کی جماعت کو تفویض کر دی گئی۔ کہہ سکتے ہو تو یہ کہہ سکتے ہو کہ حکومت محض برائے حکومت مطلوب نہ تھی۔ کہہ سکتے ہو کہ حکومت ذاتی اقتدار اور دنیوی فوائد کے حصول کیلئے مطلوب نہ تھی۔ مگر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اقامت دین کیلئے، عدل کے قیام کیلئے، انسانیت کی نجات کیلئے، معاشرہ کی تعمیر کیلئے بھی حکومت مطلوب نہ تھی!

درحقیقت حضورؐ کے پیش نظر جہاں اعتقادی اور اخلاقی انقلاب تھا، وہاں پوری اہمیت کے ساتھ سیاسی انقلاب بھی تھا۔ جہاں فرد کی اصلاح مطلوب تھی، وہاں تمدن کی درستی بھی مقصود تھی۔ دوسرے لفظوں میں حضورؐ نے انسان کو ایک اجتماعی وجود کی حیثیت سے سامنے رکھا۔ اور اس کی اصلاح اس کے جملہ تمدنی رابطوں سمیت کرنا چاہی۔ حضورؐ نے انسان کو تمدن سے منقطع فرد کی حیثیت سے نہیں لیا اور اپنی دعوت اس کی نجی زندگی تک محدود نہیں رکھی۔ یہ حقیقت سامنے رکھیے اور حضورؐ کے نصب العین کی پوری وسعت کو ذہن نشین کر لیجئے تو پھر واقعات سیرت میں پورا تسلسل دکھائی دے گا اور ہر واقعہ اور اقدام اور تدبیر کی توجیہہ ہوتی جائے گی۔ بصورت دیگر نہ سیرت پاک کے اسرار کھلتے ہیں اور نہ قرآن مقدس کے نکات واضح ہوتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

بالشت بھر کی عورت

چچی اسماء کے بارے میں رقیہ کا شروع سے ہی امپریشن خراب تھا۔ کچھ کچھ خشک مزاج، مغرور اور کنجوس..... نانی اماں کے مقابلہ میں اسماء چچی رقیہ کے دل میں ذرہ بھر جگہ ایک لمحہ کیلئے بھی نہ بنا سکیں۔ ماریہ نے محسنہ نے حمنہ نے سب نے سمجھایا کہ تمہاری غلط فہمی ہے اسماء چچی تو ہیں ہی بہت نائس..... بہت اچھی.....لیکن رقیہ نے مانا تھا نہ مان کے دیا.....!! اور کل تو حد ہی ہوگئی ان کے بارے میں جو ایک نقطے جتنا سوفٹ امیج بنا بھی تھا وہ بھی اڑ.....ڑ.....دھم.....''

ہوا یوں کہ رقیہ کو کالج سے ہی اکیڈمی جانا پڑ گیا۔ پریکٹیکل کرتے ہوئے اتنی دیر ہوگئی کہ رکشے والا ہارن بجا بجا کر..... پاں پاں کر کے کب کا رخصت ہو چکا تھا اور کالج کے سامنے کی سڑک خالی پڑی تھی.....اس نے گھڑی پر وقت دیکھا دو بج کر چالیس منٹ ہو چکے تھے ان بیس منٹوں میں گھر جانا، کھانا کھانا اور اکیڈمی پہنچنا کسی طور پر ممکن نہ تھا سو وہ بڑے بڑے قدم اٹھاتی اکیڈمی ہی کی طرف چل پڑی..... وہاں پہنچی تو قدیم طرز کی حویلی میں بنی اکیڈمی بھی خالی ڈھانڈ پڑی تھی..... بندہ نہ بندے کی ذات.....!! وہ ہونق بنی دیکھتے دیکھتے گیٹ سے باہر نکل آئی۔

اوئے.....اس کی نظر گیٹ کے اوپر لگے نوٹس بورڈ پر پڑی۔ آج چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر اکیڈمی بند رہے گی۔

پیسہ دھیلا ہاتھ میں تھا نہ بیگ میں، انہی قدموں پر چل کر گھر پہنچی..... مسلسل پینتیس چالیس منٹ چلتے رہنے سے قدم اٹھاتی تو سارا جسم احتجاج کرتا۔ بھوک..... بھوک..... بھوک..... بیگ صوفے پر پھینک کر کچن پہنچی تو ہر برتن دھو دھلا کر رکھا ہوا تھا۔

ہونہہ صفائی ستھرائی کی عملبر دار بنتی ہیں، گھر والے بھلے بھوکے مر جائیں۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا..... اسے اچھی طرح پتہ تھا کہ دوپہر کے کھانے کی ڈیوٹی اسماء چچی کی ہے.....نہ بھی پتہ ہوتا تو تائی اماں اور اس کی اپنی امی دونوں کھانا کھلانے اور پکانے کی حد تک ہی کام کرتیں۔ باورچی خانہ رات گئے تک گندگی کا شاہکار بنا رہتا.....سب لوگ اسماء چچی کے سلیقے طریقے کی تعریف کرتے رقیہ ناک منہ چڑھاتی۔

ہونہہ اپنے آپ کو نمایاں کرنے کا خبط ہے اور کچھ نہیں اس نے فریج کھولا.....وہ بھی اس کے پیٹ کی طرح خالی تھا.....کچھ ڈبے پڑے تھے جن میں ظاہر ہے آٹا یا دال قسم کی چیز ہی ہونا تھی۔ مارے غم کے اور بھوک کے وہ وہیں لیٹ گئی۔ اتنے میں اسماء چچی اندر آئیں۔

ارے تم آ گئیں رقیہ.....چلو ہاتھ دھو لو میں کھانا لاتی ہوں.....

''ہونہہ ہاتھ دھو جیسے خود تو پاؤں دھو کر کھانا کھاتی ہیں۔ رقیہ منہ ہی منہ میں بڑبڑ کرتی رہی..... بوتل کے جن کی طرح چند سیکنڈ میں گرما گرم اشتہاء انگیز پلاؤ کباب رائتہ اس کے سامنے تھا.....

''لو کھاؤ میں نے ہاٹ پاٹ میں رکھ دیا تھا کہ گرم رہے۔'' انہوں نے ٹرے اس کے سامنے رکھی۔

کھانا ختم بھی نہ کیا تھا کہ گرما گرم چائے کا کپ بھی حاضر ہو گیا.....

جونہی چاولوں کی لپیٹ پلیٹ میں منتقل ہوئی تو کچھ ہوش ٹھکانے آئے..... چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا تو سر سے پاؤں تک کی تھکاوٹ بھی اڑن چھو ہوگئی.....

اسماء چچی کے بارے میں اس کے نظریات تھوڑے سے بدل گئے۔ ہمیشہ کالج سے واپسی پر اسے کھانا ٹھنڈا ہی ملتا تھا بجلی گئی ہوتی تھی اوون میں کیسے گرم کرتے؟ پوچھنے پر یہی جواب ملتا، آج چار بجے بھی

کھانا تروتازہ تھا..... یقیناً یہ ایک خوبی تو ہے ان میں..... بالآخر رقیہ نے اعتراف کر ہی لیا۔

اسماء چچی گھر کے سارے لوگ کہاں ہیں؟ نظر نہیں آ رہے.....، اس نے سفید دوپٹے سے سر ڈھانپے کام نمٹاتی چچی سے پوچھا۔

ارے تمہیں بتانا بھول گئے آج رضوانہ پھوپھو کے ہاں درس قرآن ہے۔ سب وہیں گئے ہیں۔ میں تمہاری وجہ سے رک گئی تھی تم بھی جلدی سے کپڑے تبدیل کرلو، بس پانچ سات منٹ ہی رہتے ہیں درس شروع ہونے میں.....انہوں نے وارڈ روب کھول کر اس کا سوٹ اسے تھماتے ہوئے کہا۔ کچھ درس کے شوق میں اور کچھ رضوانہ پھوپھو کی سمیعہ بیٹی اس کی دوست تھی سو وہ جھٹ پٹ کپڑے پکڑ کر غسل خانے میں گھس گئی..... باہر آئی تو اسماء چچی نے گاؤن پہن کر بیگ ہاتھ میں لیا ہوا تھا.....جس کا مطلب تھا تیاری مکمل.....اسماء چچی کے بارے میں عینک بدلی تو زاویہ نظر بھی بدل گیا ضرورت کی بات کرتی ہیں اور ہر کام پھرتی سے نبٹاتی ہیں رقیہ بھی ان کے پیچھے گھر سے نکلی۔ رضوانہ پھوپھو کا گھر ساتھ والی گلی میں تھا۔ ہال کھچا کھچ خواتین سے بھرا ہوا تھا.....درس دینے والی خاتون ان کی جانی پہچانی حمیرا خالہ تھیں۔ موضوع تک پہنچتے پہنچتے حالات حاضرہ، امت مسلمہ، پاکستان اور یہاں کے حالات بھی بیان کئے گئے۔ سیلاب زدگان کیلئے مدد کا بھی اشاروں کنایوں میں ذکر تھا۔ انداز بیاں پرتاثیر تھا..... سبھی توجہ سے سن رہے تھے۔ یونہی رقیہ کی نظر پڑی اسماء چچی کی آنکھ کے نیچے ننھا منا سا آنسو ٹکا ہوا تھا۔ یا شاید اس کا وہم تھا۔

درس کے بعد ہر خاتون نے حسب توفیق مدد کیلئے بند مٹھی کھولی۔ رقیہ خاص طور پر نوٹ کر رہی تھی ڈبے میں جاتے نوٹ اسے اچھی طرح نظر آ رہے تھے۔ ہرے، نیلے نوٹ تو ایک آدھ ہی تھے۔ زیادہ تر سو پچاس کے نوٹ ڈالے جا رہے تھے۔

اسماء چچی کا ہاتھ بھی اپنے ہینڈ بیگ میں گیا یقیناً وہ بھی دینے کے لئے نوٹ نکال رہی تھیں۔

رقیہ کا دل دھڑکا.....کل تک وہ اسماء چچی کو کنجوس کہتی آئی تھی دیکھئے آج کیا دیتی ہیں۔

انہوں نے ڈبے میں نیچے کر کے ہاتھ ڈالا۔ اسماء نے عادت کے برعکس قریب ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اچک کر دیکھا۔ دس روپے کا نوٹ تھا۔ مڑا تڑا سا.....

''اوہ.....'' اس کے منہ سے صدمے کی کیفیت میں بس یہی لفظ نکلا۔

درس والی حمیرہ خالہ ایک تنظیم سے وابستہ تھیں یہ رقم انہوں نے سیلاب زدگان کی مدد کیلئے جمع کی تھی جو رقیہ ڈبے سے نکال کر جمع کر رہی تھی۔ تقریباً دو اڑھائی ہزار روپے بنتے تھے.....ارے اسماء چچی والا دس کا نوٹ کہاں گیا.....اس نے ڈبے کو ہلاتے ہوئے سوچا.....کسی کونے کھدرے سے بالآخر وہ بھی نکل آیا۔ اسے اٹھا کر باقی رقم میں شامل کرتے ہوئے ایسے ہی رقیہ ٹھٹھکی۔

ارے یہ نوٹ کچھ وزنی سا کیوں ہے، اس نے بے تابی سے نوٹ کھولا۔

اندر پانچ پانچ ہزار کے دو نوٹ تہہ کئے ہوئے پڑے تھے.....!!

یہ نوٹ کس نے ڈالے تھے؟ اسے پتہ چلانے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اسماء چچی اس کے دل کی مسند پر جم کر بن سنور کر براجمان ہو چکی تھیں۔

اور خود رقیہ.....! اپنی نظروں میں اپنا مقام اتنا گرا محسوس کرنے لگی جیسے ایک بالشت بھر کی عورت۔

☆.....☆.....☆

سفرِ شوق

2009ء میں عمرہ ادا کرنے کے بعد لکھی گئی

وہ راہِ شوق کی منزل وہ مکہ یاد آتا ہے
مجھے لاہور میں رہ کر مدینہ یاد آتا ہے

وہ عمرہ کی سعادت کا عطا اک بار پھر ہونا
وہ زمزم یاد آتا ہے وہ کعبہ یاد آتا ہے

صدا لبیک کی ہر سُو تھی کعبہ کی فضاؤں میں
وہ مکہ کے مسافر کا ترانہ یاد آتا ہے

طوافِ کعبہ کا منظر صدائیں وہ دعاؤں کی
حطیم و حجر اسود، بابِ کعبہ یاد آتا ہے

لپٹنا ملتزم سے زائروں کا اور رو پڑنا
وہ آنسو یاد آتے ہیں وہ گریہ یاد آتا ہے

جنابِ ہاجرہ کی پیروی میں پھر سعی کرنا
چٹانیں وہ صفا کی جبلِ مروہ یاد آتا ہے

حرم کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر نظارۂ کعبہ
نزولِ رحمت باری کا جلوہ یاد آتا ہے

وہ اذانِ حرم کا سوز، تکبیریں نمازوں کی
وہ صف بستہ غلاموں کا قرینہ یاد آتا ہے

عقیدت کا محبت کا سفر پھر جانبِ طیبہ
وہ منزل یاد آتی ہے وہ رستہ یاد آتا ہے

رسولؐ پاک کی بستی میں جو کچھ دن گزارے تھے
وہ احساس اُنؐ کی قربت کا ہمیشہ یاد آتا ہے

نمازیں مسجد نبوی کی، قرآں کی تلاوت بھی
عبادت میں وہاں گزرا جو عرصہ یاد آتا ہے

وہ مسجد یاد آتی ہے وہ منبر یاد آتا ہے
وہ جالی، سبز گنبد اور روضہ یاد آتا ہے

درود انؐ پر سلام اُن پر وہ پڑھنا صبح و شام اپنا
درودیوار روضہ کے ، مواجہ یاد آتا ہے

پلٹنا جانبِ مکہ کو پھر عمرہ کی نیت سے
وہ میقاتِ مدینہ، ذوالحلیفہ یاد آتا ہے

مقدس شہر مکہ میں بھی رہنا اپنے بچوں میں
مجھے ان روز و شب کا لمحہ لمحہ یاد آتا ہے

وہ یاد آتا ہے عبداللہ وہ طلحہ یاد آتا ہے
وہ حنظلی یاد آتا ہے حذیفہ یاد آتا ہے

مجھے لاہور میں رہ کر مدینہ یاد آتا ہے

ڈاکٹر مقبول احمد شاہد

مٹی کے باوے

''دعا ضرور کروں گا بشرطیکہ ایک کپ کافی بطور رشوت اگر اس وقت پلا دو مجھے پتہ ہے رات کے گیارہ بجے کچن میں جانا تمھیں بہت ناگوار ہے اس لیے کہتا ہوں کہ چوبیس گھنٹے کے لیے ایک ماسی رکھ لو۔''

''نہیں..... جو نوکر گھر میں ہوتے ہیں وہ ہر بات سنتے اور دیکھتے ہیں اس طرح گھر کی باتیں باہر جاتی ہیں۔ چوریاں ہوتی ہیں اور پھر جو لوگ محروم ہوتے ہیں اگر ہم ان کے ساتھ انصاف نہ کر سکیں تو مجرم اور گنہگار ٹھہریں۔ بس میں ابھی کافی لے کر آئی۔''

شکریہ میری ہمدم..... ابھی جو تم نے نوکر نہ رکھنے کے دلائل دیے ہیں میں سوچ رہا ہوں۔ ان موضوعات پر تم نے کہاں سے ایم ڈی کی ہے۔ میں تم سے بالکل متفق ہوں۔

''چھوڑیں بھی میرا مذاق نہ بنائیں۔''

☆☆☆

جمعہ کا دن تھا ڈاکٹر وردہ نے دو رکعت نماز نفل صبح کے وقت پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے مدد مانگی اور تیار ہو کر وقت پر پہنچ گئی۔ فرحت اس سے پہلے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

''السلام علیکم!'' فرحت کھڑی ہو گئی۔ آج وہ بڑی سی سیاہ چادر میں ملبوس تھی۔

''وعلیکم السلام''..... آؤ فرحت اس سائیڈ روم میں بیٹھتے ہیں۔ آج کوئی مریض نہیں ہے اور کافی وقت ہے تم تفصیل سے بتاؤ۔ پہلے اپنی خاندانی بیک گراؤنڈ کے بارے میں بتاؤ۔'' وہ قلم کاغذ لے کر ساری معلومات نوٹ کرنے لگی۔ ''کتنے بہن بھائی ہیں؟''

''ہم صرف چار بہنیں ہیں ہمارا کوئی بھائی نہیں۔''

''اور والد.....؟''

''ان کا انتقال ہو گیا ہے بلکہ یوں سمجھیں کہ اُن کا قتل ہوا تھا.....''

''وہ کیسے.....؟''

ابا جان اور چاچو نذیر احمد اکٹھے رہتے تھے۔ یہ گھر دادا جان نے بنایا تھا لیکن پیسہ ابا جان کا تھا کیونکہ وہ اس وقت سعودیہ میں جاب کر رہے تھے اور چاچو یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے۔ دادا جان نے کوئی وصیت نہ کی نہ ہی جائیداد اور کاروبار کو دونوں بھائیوں میں تقسیم کیا۔ اور دنیا سے چلے گئے۔ چاچو کچھ عرصہ ٹھیک رہے لیکن بعد میں انھوں نے مطالبہ کیا کہ جائداد تقسیم کریں۔ گھر ایسے بنا ہوا تھا کہ درمیان میں دیوار بنانا مشکل تھا ابا جان نے کہا کہ تم پیسے لے لو اور گھر الگ خرید لو۔ انھوں نے کہا کہ آپ گھر خالی کریں۔ گھر مجھے دے دیں اور کاروبار آپ رکھ لیں۔ ہم سب کو اس گھر سے بہت محبت تھی۔ دونوں بھائیوں میں جھگڑا ہو گیا۔ چاچو نے ابا جی کو دھکا دیا۔ وہ ستون کے ساتھ ٹکرائے اور اُن کا سر پھٹ گیا۔ ہسپتال لے کر گئے لیکن ان کا راستے میں ہی انتقال ہو گیا۔ اب ہم سب دیکھ رہے تھے کہ چاچو ابا جان کے قاتل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر تم نے رپورٹ درج کروائی یا منہ سے بات نکالی تو میں تم سب کو گھر سے نکال دوں گا۔ کاروبار تو ان کے قبضے میں آ چکا تھا۔

امی بیمار تھیں۔ ہم چھوٹے تھے۔ اس وقت خاموش ہو گئے۔ جب ذرا بات پرانی ہوئی تو ہم گرمیوں کی چھٹیوں میں گاؤں گئے ماموں کے گھر..... وہاں امی اپنے بھائی کے گلے لگ کر بہت روئیں۔ سارا محلّہ اکٹھا ہو گیا اور امی نے بتا دیا کہ میرے شوہر کو اس کے بھائی نے قتل کیا تھا۔

ماموں چند لوگوں کو لے کر گئے۔ چاچو کو خبر مل چکی تھی۔ انھوں نے ملنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اپنی بہن سے کہیں اپنا سامان لے کر یہاں

سے دفع ہو جائیں۔

خاندان کے بڑوں نے بہت سمجھایا لیکن وہ نہ مانے۔ یوں ہم شہر سے گاؤں آ گئے۔ ماموں کے پاس .....سکول، سہیلیاں بچپن، گلیاں، رستے، باغ، بازار.....سب کچھ چھن گیا۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ رہا۔ گاؤں کا گھر بہت بڑا تھا۔ ماموں خیال رکھتے، دل جوئی کرتے مگر ممانی کا رویہ اچھا نہ تھا۔ اگر ہم میں سے کوئی ان کی بات نہ مانتا تو وہ طوفان کھڑا کر دیتیں۔ میں نے دسویں کا امتحان دیا تھا۔ گاؤں میں پرائمری سکول تھا۔ نوکری مل گئی۔ ہم نے کھانا پکانا الگ کر دیا تو ذرا سکون ملا۔ مجھ سے چھوٹی آمنہ پھر سعدیہ اس کے بعد رباب.....تینوں نے سکول جانا تھا۔ سکول دور تھا، رباب تو میرے ساتھ چلی جاتی۔ ماموں نے تانگہ لگوا دیا تھا۔ میں نے پرائیویٹ ایف اے، پھر بی اے، پھر ایم اے کیا۔''

''بہت خوب! بڑی بہادر ہیں۔ آپ ماشاءاللہ'' ڈاکٹر وردہ نے اس کی تحسین کی۔

''ماموں کا بیٹا جمال تھا جو مجھ سے دو سال چھوٹا تھا۔ وہ مجھے پسند کرتا تھا۔ مجھے بھی وہ اچھا لگتا تھا لیکن میں نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہ کی کہ ممانی نہیں مانیں گی۔

ماموں نے امی کے حصے کی زمین بیچ کر مقدمہ دائر کیا کہ چچا سے ہمارا حق ہمیں لے کر دیں۔ دس سال مقدمہ چلتا رہا۔ امی کی جائداد وکیلوں کی فیسوں میں برابر ہو گئی۔ آخر میں چاچو آئے کہ صلح کر لیں میں ان کا حصہ ان کو دے دوں گا لیکن یہ ان کی چال تھی۔ ہم نے مقدمہ واپس لے لیا اور وہ وعدے سے مکر گئے۔

پھر جمال نے اپنے والدین سے کہا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ممانی نے میرے کردار پر خوب کیچڑ اچھالا اور کہا کہ وہ عمر میں بڑی ہے اس سے میں بیٹے کی شادی ہرگز نہیں کروں گی۔ ماموں نے بڑی کوشش کی حتیٰ کہ طلاق کی دھمکی دی تو امی نے منع کر دیا کہ ایک گھر بسانے کے لیے اپنا گھر نہ اجاڑو۔ ماموں بولے کہ آمنہ اس سے دو سال چھوٹی ہے لیکن عمر کا تو بہانہ تھا۔

پھر حالات اتنے خراب ہوئے کہ جمال ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ ممانی نے بات کرنا بند کر دیا۔ ہمارا رہنا مشکل ہو گیا۔ ماموں نے صحن میں دیوار کر کے ہمیں الگ گھر دے دیا۔ آمنہ نے بی ایس سی کر کے بی ایڈ کیا تو اسے گورنمنٹ کالج میں جاب مل گئی۔ رہنے کے لیے گھر ملا تو ہم سب شہر میں شفٹ ہو گئے۔ لیکن اب نہ وہ محلّہ تھا نہ گلیاں، نہ وہ ہمسائے نہ لوگ..... بارہ سالوں میں دنیا بدل چکی تھی۔ مہر و وفا، بھائی چارہ سب ختم۔ سعدیہ نے زوالوجی میں ایم ایس سی کی تو اسے بھی جاب مل گئی۔ رباب کہنے لگی میں ڈاکٹر بنوں گی۔ لیکن اس کے نمبر نہ آئے اور پرائیویٹ کالج میں ہم کہاں پڑھاتے۔ جہاں ایک سال کا خرچ آٹھ لاکھ ہو۔ اس نے اردو میں ایم اے کر لیا۔ روتے، لڑتے، کڑھتے ہوئے اب رشتے آتے۔ تو کہتے اس کی عمر زیادہ ہے، سر میں سفید بال ہیں۔ آمنہ پسند آتی تو کہتے ان کا تو گھر ہی نہیں ہے۔ سعدیہ کا رشتہ آیا تو کہنے لگے نہ باپ نہ بھائی نہ کوئی مرد رشتہ دار..... نہ جانے یہ کیسی عورتیں ہیں، ہم برادری میں کیا منہ دکھائیں گے۔ مرد ہی کوئی نہیں ہے کس سے بات کریں۔ اور یہ استانیاں..... یہاں سے کیا جہیز ملے گا۔ صرف گورے رنگ سے اور ڈگری سے تو شادی نہیں کرنی۔

ہماری تعلیم، شرافت، محنت، سلیقہ، دینداری، صبر، مشکلات کا مقابلہ، سادگی، حسن .....اس معاشرے نے اٹھا کر ہمارے منہ پر مار دی۔ یہ سارے کھوٹے سکے تھے۔ اب اس سوسائٹی اور اس شہر میں ان کی مانگ نہیں ہے۔

پھر کمیٹی ڈال کر ڈھائی مرلے کا پلاٹ لیا۔ اس پر جھگیوں والے آ کر بیٹھ گئے۔ دو سالوں سے کوشش کر رہے ہیں کہ دو کمرے بنا لیں مگر وہ نہیں جاتے۔

امی کو سٹروک ہوا اور فالج سے بستر پر گر پڑیں۔ اب ماں زندہ ہے، ایک خاندان کا ڈھانچہ قائم ہے لیکن جب یہ بھی جاں سے گزر گئی تو ہم.....معاشرے نے تو ہمیں ریجکٹ کر دیا ہے بڑھاپا بھی آئے گا، نوکری کی مدت بھی ایک دن ختم ہو جائے گی، تو ہم مٹی کے باوے کدھر جائیں گے؟ سر پر چھت نہیں، گھر میں کوئی مرد نہیں، آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہیں..... میں سب سے بڑی ہوں۔ ۲۶ سالوں سے بڑا بھائی بن

کر سب کی دیکھ بھال کر رہی ہوں۔ پچھلے سال ماموں کا بھی انتقال ہو گیا۔ یہ تین مرد تھے۔ ابو قتل ہو گئے۔ ماموں فوت ہو گئے۔ جمال لاپتہ ہو گیا یہ انسان تھے۔ ہم مٹی کے باوے نہ قتل ہوئے نہ موت آئی نہ زندگی نے گلے لگایا۔

اب صرف ایدھی سنٹر یاد آتا ہے جی چاہتا ہے ابھی وہاں جا کر جاب کر لوں کم از کم مرتے دم تک پناہ، روٹی اور شاید علاج بھی ملتا رہے گا۔

ہم بھلا اس دنیا میں کیا کرنے آتے ہیں؟ اللہ تو دیکھ رہا ہے نا .....وہ ایک دن بیٹی (جو رحمت ہے) کو اس دنیا میں بھیجنا بند کر دے گا۔ دنیا والوں نے اس کی کیا قدر کی.....اس کو ذلیل و رسوا کر دیا اس کو انسان بھی نہیں سمجھا.....مرد ہی اس کا حوالہ ہے تو پھر میرے چاچو جیسے مرد اللہ کو کیا جواب دیں گے!!''

پتہ ہی نہ چلا دو گھنٹے ہونے والے تھے۔ اس نے مائی سے کہہ کر چائے اور کچھ کھانے کیلئے منگوایا۔ وردہ کا دماغ گھوم رہا تھا دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہی تھی کہ ہم کیا سمجھے تھے۔ اسے کسی کا شعر یاد آیا۔

وہ موم تو تھا عشق کی تاثیر سے ہوا
یہ واقعہ مگر بڑی تاخیر سے ہوا

''اچھا تو اب کیسا محسوس کرتی ہو۔''

اس دنیا میں کالج میں آتے جاتے اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتی ہو کہ کسی اور دنیا کی اور ہی مخلوق ہوں پتہ نہیں یہاں کیسے آ گئی۔ کھانا میں خود بناتی ہوں۔ امی کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا میری ذمہ داری ہے۔ دوائی دینا، نہلانا، وقت دینا.....سعدیہ اور آمنہ ٹیوشنز پڑھاتی ہیں۔ رباب باغی ہو گئی ہے۔ کہتی ہے شادی تو ہونی نہیں اب انجوائے بھی نہ کروں۔ وہ کلب کی ممبر بن گئی ہے یونیورسٹی سے سیدھی وہاں چلی جاتی ہے۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ کہتی ہے کہ میں گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ آپ کو اس سادگی، فرمانبرداری اور شرافت نے کیا دیا جو میں آپ کے نقش قدم پر چلوں۔ میں اس ظالم سوسائٹی سے اپنے حصے کی خوشیاں چھین لوں گی۔ نادان ہے۔ پر کیا کروں! اب آپ میرا کیا علاج کریں گی۔'' وہ بولی۔''

''آپ کے سوشل مسائل زیادہ ہیں وہ حل ہو جائیں تو ہی علاج ہو سکتا ہے بلکہ یہی آپ کا علاج ہے۔

اتنے میں ڈاکٹر ساجد کا فون آیا۔

''کہاں ہو مائی ڈیئر لیڈی.....میٹنگ میں نہیں آؤ گی۔''

''آپ مایوس نہ ہوں۔ اس کاغذ پر اپنے چاچو کا نام پتہ اور فون نمبر لکھ دیں۔ اپنے کالج کا ایڈریس، گھر کا نمبر اور موبائل نمبر بھی لکھیں میں خود آپ کو فون کروں گی۔ رپورٹیں آج نہیں ملیں۔ شاید اگلے ہفتے تک آ جائیں۔''

''میں اب جاؤں۔'' اس نے بڑے مطمئن انداز سے پوچھا جب وہ پہنچی تو میٹنگ ختم ہونے والی تھی۔ پچیس ڈاکٹرز میز کے اردگرد بیٹھے تھے، پڑھے لکھے، قابل، سپیشلسٹ فارن کوالی فائیڈ اپنے اپنے فیلڈ کے ماہر پروفیسر.....

ڈاکٹر وردہ بولی۔ ''آئی ایم سوری مجھے دیر ہو گئی۔ میرا آپ سے ایک سوال ہے کہ سوشل سسٹم مریض کو کس حد تک متاثر کرتا ہے اور اس کے حالات کو بدلے بغیر کیا علاج ممکن ہے؟''

ڈاکٹر راشد سمیع خان بولے۔ ''سوشل سسٹم بدلنا حکومت کا کام ہے ہمارا نہیں۔ ہم تشخیص کر کے دوائی لکھ سکتے ہیں۔ ہم سوشل ورکر نہیں ہیں۔''

''گڈ.....میری درخواست ہے کہ اگلی میٹنگ میں ایک سوشل ورکر کو بھی دعوت دیں۔''

گھر جا کر ڈاکٹر وردہ نے سارا حال سنایا اور اس کا ایڈریس بھی ڈاکٹر ساجد کو دیا وہ دیکھ کر بولے ''نذیر احمد پیرزادہ؟ یہ تو میرے پرائیویٹ کمرے میں ایڈمٹ ہے۔ ایڈریس بھی یہی ہے لو یہ تو سمجھو لاٹری نکل آئی۔ بس مجھے کنفرم کرنے دو۔'' انہوں نے فون کر کے نمبر اور ایڈریس کنفرم کیا۔ ''یہی فرحت کے چاچو ہیں۔ صبح بات کریں گے۔''

اتنے میں فرحت کا فون آیا کہ ''امی کی حالت بہت خراب ہے میں ان کو لے کر ہسپتال جا رہی ہوں۔''

''اچھا.....تم ایمرجنسی میں لے کر جانا میں بھی آ رہی ہوں۔''
ڈاکٹر ساجد نے سن لیا۔''چلو میں بھی چلتا ہوں۔''
فرحت کی امی کو ہلکا سا ہارٹ اٹیک تھا۔ ڈاکٹر وردہ وہاں چلی گئیں۔ ڈاکٹر ساجد سیدھے وی آئی پی روم میں چلے گئے۔ ہاؤس سرجن اور دو نرسیں ان کو ڈرپ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ساری رگیں بیٹھ گئی تھیں۔ رگ نہیں مل رہی تھی۔ ڈاکٹر ساجد نے کہا کہ ٹانگ پر پاؤں کے قریب ٹرائی کرو۔ مل جائے گی۔
اس نے پوچھا:''نذیر صاحب.....آپ کتنے بہن بھائی ہیں۔''
''ہم دو بھائی تھے۔ میرے بڑے بھائی بشیر پیرزادہ ان کا انتقال ہو گیا تھا بہت عرصہ پہلے۔''(اب ڈاکٹر ساجد کو یقین ہو گیا فرحت نے اپنے والد کا یہی نام بتایا تھا۔)
''کیا وہ طبعی موت مرے تھے۔''ڈاکٹر نے اگلا سوال کیا۔
''مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں'' نذیر پیرزادہ کچھ مضطرب ہو گئے۔
''وہ آپ کو سوئی لگا رہے ہیں ڈاکٹر ارجمند.....تو میں نے سوچا آپ کی توجہ کسی اور طرف ہو جائے۔''
''کیا اس بھائی کی کوئی اولاد بھی تھی یا لاولد تھے۔''
'لاولد ہی سمجھیں.....بیٹا نہیں تھا چار بیٹیاں ہی تھیں۔''
''اب وہ لوگ کہاں ہوتے ہیں.....''
''مجھے کیا معلوم.....وہ تو گھر چھوڑ کر ہماری بھابھی گاؤں بھائی کے ساتھ چلی گئی تھی۔''
''اور آپ نے کبھی مڑ کر ان یتیموں کی خبر نہ لی؟''
اب نذیر پیرزادہ پھر پریشان ہو گئے کہ آج ڈاکٹر ساجد کو کیا ہو گیا ہے۔ بولے''کیا میرا جگر تبدیل کرنے کا کوئی انتظام ہو گیا ہے؟''
''آپ کو جگر سے پہلے دل تبدیل کروانا ہو گا۔'' وہ سختی سے بولے۔
''مگر میرا دل تو ٹھیک ہے کیا یہ بھی بدلا جا سکتا ہے؟'' وہ حیران تھے۔
''سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے۔ سب کچھ بدل سکتا ہے۔ خون، رشتے، تعلق، دوستی، دل، گردے، محبت.....سب کچھ!''
''ڈاکٹر صاحب کیا بات ہے آج آپ کی باتیں بڑی ذو معنی سی لگ رہی ہیں کیا آپ صوفی ہو گئے ہیں۔''
''ہر بندے کے اندر ایک صوفی ہوتا ہے جو سچ بولنا چاہتا ہے مگر ہماری لالچ ہمیں وہ آواز سننے نہیں دیتی۔''
ڈرپ لگ گئی۔ ڈاکٹر فارغ ہو کر آئی سی یو میں چلا گیا۔
''آپ زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ نذیر صاحب''
''کون مرنا چاہتا ہے۔ میرا ایک ہی بیٹا زندہ رہ گیا ہے تین بچوں کو دفنا چکا ہوں۔ اس کا سہرا دیکھنا چاہتا ہوں بس یہی ایک آرزو ہے۔''
''آپ کے بھائی بشیر پیرزادہ زندہ ہوتے تو وہ بھی کہتے کہ میری بیٹیاں عزت سے رخصت ہو جائیں۔ ہر والدین یہی کچھ چاہتے ہیں۔''
''آپ کی باتوں نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ صاف صاف بتائیں کیا بات ہے۔ میں کوئی صدمہ برداشت نہ کر پاؤں گا۔''
میرے پاس آپ کی تندرستی کا نسخہ ہے۔ آپ نے کسی کا حق مارا ہے، زیادتی کی ہے۔ ظلم کیا ہے، غفلت برتی ہے یا قطع رحمی کی ہے تو..... حق داروں کو حق دیدیں، صلہ رحمی کریں، ظلم کی معافی مانگیں، اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کریں۔ اس کا در کھلا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ liver ٹرانسپلانٹ کی ضرورت نہیں۔
''اف میرے خدا.....یہ میں کیا سن رہا ہوں۔''
''اچھا ہے نا کہ وہ مر جائیں گی تو ان کی بد دعائیں آپ کا پیچھا نہیں کریں گی۔''
''ڈاکٹر صاحب میں بہت بدنصیب آدمی ہوں۔ فرحت کو بلا دیں میں اس سے معافی مانگ لوں۔ میں تو جا نہیں سکتا۔ میں ان کی ساری جائیداد اور گھر ان کو واپس کر رہا ہوں۔ ابھی لکھ دیتا ہوں۔''
انہوں نے ڈاکٹر وردہ کو فون کیا کہ فرحت اور آمنہ کو لے کر وی آئی پی روم میں آ جاؤ۔
''آؤ..... آؤ فرحت یہ رہا آپ کا مجرم..... چاچو نذیر،

پیرزادہ.....اپنی غلطیوں پر شرمندہ ہیں اور آپ کا حق واپس کر رہے ہیں''

''غلطی؟ قاتل، چور ڈاکو.....ہم سب کی زندگیاں برباد کر دیں ہماری ماں موت کے منہ اس ظالم کی وجہ سے ہے اب انہیں معافی یاد آئی ہے۔''

''ہاں بیٹی تم سچ کہہ رہی ہو۔''

''خبردار جو مجھے بیٹی کہا۔ ہم کسی کے کچھ نہیں لگتے۔ ہم مٹی کے باوے ہیں ان سے آپ کا کیا رشتہ۔''

اوپر سے پیرزادہ کا بیٹا عبید آ گیا تھا اس نے بھی سب کچھ سنا اور پریشان ہو گیا۔

''ابو مجھے شرم آ رہی ہے۔ آپ کو بات کہتے ہوئے۔ آپ نے یہ دولت میرے لئے اکٹھی کی تھی اور مجھ سے رشتے چھین لئے۔ آپ نے مجھ پر بڑا ظلم کیا۔'' وہ واپس پلٹا اور فرحت کے پاؤں پڑ گیا۔ ''باجی میں بے قصور ہوں مجھے معاف کر دو اور اپنے گھر واپس چلو۔ میں آپ کا بھائی ہوں۔ میری ماں فوت ہو گئی ہے میں تنہا ہوں۔'' ڈاکٹر وردہ نے کہا ''فرحت معاف کر دو۔''

فرحت نے عبید کو گلے لگا لیا۔ اگلی صبح دو بلڈ لگنے کے بعد اس کی امی نے آنکھیں کھول دیں۔ ڈاکٹر ساجد نے بتایا کہ جگر کا عطیہ کرنے والا مل گیا ہے۔ ''مجھے اب نہیں چاہیے۔'' نذیر احمد نے جواب دیا۔

''واقعی آپ کا دل تبدیل ہو چکا ہے۔ دو ہفتے بعد ڈاکٹروں نے متفقہ طور پر اس معجزے کی تصدیق کی کہ ان کا جگر نارمل طریقے سے کام کر رہا ہے۔

سب لوگ اپنے پرانے گھر شفٹ ہو گئے اس ماہ کے آخر میں عبید اور رباب کی شادی ہو گئی۔ جب ڈاکٹر وردہ اور ساجد اس سارے واقعے پر تبصرہ کرنے بیٹھے تو بولے۔ ''وردہ اس ساری کامیابی کا سہرا تمہارے سر جاتا ہے۔''

''نہیں ساجد آپ میرا ساتھ نہ دیتے تو یہ کیسے ممکن تھا۔ اصل میں تو اللہ پاک کو اب فرحت کی اور اس کے خاندان کی آزمائش ختم کرنا مقصود تھا۔ اس نے ہم دونوں کو وسیلہ بنا دیا۔''

''درست..... یہ بھی علاج ہے یہ بھی نیکی ہے۔ لیکن ہم نے کبھی اس طرف دھیان نہیں دیا۔ کیوں نہ ہم ایک ''سوشل کلینک'' کھول لیں۔''

''جناب اصل بات یہ ہے کہ لڑکیوں کی شادی کیلئے رشتے کہاں تلاش کرنے جائیں گے۔'' یہ وردہ کا اندیشہ بول رہا تھا۔

''ہمیں پتہ تھا کہ نذیر صاحب ہمیں اسی ہسپتال میں اس حال میں مل جائیں گے؟ اتنے لوگ روزانہ آؤٹ ڈور میں آتے ہیں انہی میں ضرورت مند بھی ہوتے ہیں مل ہی جائیں گے۔ اللہ پاک نے جوڑے تو بنائے ہیں نا۔''

''لیکن اتنی سر دردی کون کرے گا۔ لوگ زیادہ ڈاکٹر مصروف، وقت تھوڑا.....مشکل ہے۔ باقی ڈاکٹر ہمارا مذاق اڑائیں گے۔ کیونکہ ہم نے تو میڈیسن کا علم حاصل کیا ہے۔ پھر سوشل پرابلم کیسے حل ہوں گے۔''

وردہ قدم بڑھانے سے گھبرا رہی تھی

ڈاکٹر ساجد شرارت سے بولے۔

اے جان اگر تم ساتھ نہ دو
تو تنہا مجھ سے کیا ہو گا

''اب آپ جذباتی طور پر بلیک میل کر رہے ہیں آپ جیتے میں ہاری۔ اپنے گھر میں ڈرائنگ روم کو سوشل کلینک بناتے ہیں۔ ہفتے میں دو دن سے سٹارٹ کرتے ہیں۔ لیکن عملہ بھی رکھنا ہو گا۔ میرے بچے میری اولیت ہیں۔ کچھ نہ کچھ خرچ بھی کرنا ہو گا۔ سوچ لیں۔''

''آپ کے خیال میں ڈاکٹر صاحب آپ اللہ کے بندوں کیلئے خود کو وقف کرینگی تو وہ آپ کیلئے آسانیاں پیدا نہ فرمائے گا۔ ضرور.....''

''کیوں نہ ڈاکٹر احسن سے مشورہ لے لیں۔ کیونکہ زیادہ تر ذہنی امراض کا علاج مشکل ہوتا ہے۔'' یہ وردہ کا خیال تھا۔

''اس لئے..... کہ ان کے ساتھ رہنے والے، ان کا خاندان یا جاب پلیس پر لوگ ان کے ساتھ جو زیادتیاں کرتے ہیں وہی ذہنی بیماریوں اور خراب رویے کا باعث بنتا ہے۔''

''چلیں جی سوشل کلینک کا بورڈ تو لگ گیا ہے اب لوگوں کو کیسے

سمجھ آئیگی۔''

''جلدی نہ کرو، مٹی کے باوے ضرور آئینگے۔''

''ہاں کل مجھے ڈاکٹر ذوالقرنین ملے تھے۔ یاد رہے جب ہم پوسٹ گریجویشن کرنے گئے تو وہاں وہ گرمزبی میں جاب کررہے تھے۔ ان کی بیوی تھیں ڈاکٹر نگینہ..... وہ جنوبی افریقہ سے واپس آ گئے ہیں۔ کیوں نہ کل دعوت کریں۔''

دوسرے دن شام کو ڈنر پر ڈاکٹر ذوالقرنین آ گئے کافی سالوں بعد دیکھا تھا۔ وقت نے ان کو عمر سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا تھا ساتھ دس سالہ بیٹی تھی۔

ڈاکٹر ساجد نے استقبال کیا۔ وردہ نے پوچھا کہ ''ڈاکٹر نگینہ نہیں آئیں۔''

''ان کا تو دس سال ہوئے انتقال ہوگیا ہے جب انعم کی پیدائش ہوئی۔''

''انا للہ وانا الیہ راجعون''

ماحول سوگوار ہوگیا۔ انہوں نے سورۃ فاتحہ تلاوت کی اور ان کی بخشش کی دعا کی۔

''پھر آپ نے دوسری شادی کیوں نہ کی۔'' یہ ڈاکٹر ساجد تھے۔

''میں جوہانسبرگ چلا گیا۔ وہاں امی تھیں۔ انعم کو انہوں نے پالا۔ اب چند ماہ پہلے وہ بھی چل بسیں۔ دل نہیں لگا تو پاکستان چلا آیا۔''

''اب جاب کرنا ہے یا پریکٹس؟''

''ابھی سوچا نہیں..... کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا ابھی تو انعم کا سکول میں داخلہ کروانا ہے۔''

کھانے کے بعد انعم بچوں کے ساتھ کھیلنے لگی۔ ڈاکٹر وردہ کچن سمیٹنے میں لگ گئیں۔

ڈاکٹر ساجد نے ان کو اپنے سوشل کلینک کے بارے میں بتایا اور مشورہ دیا اس سے منسلک ہو جائیں۔ ہم مریض دیکھیں گے، فیس بھی رکھیں گے لیکن ساتھ ساتھ ان کے سوشل مسائل سنیں گے اور ان کو حل کرنے کی کوشش کریں گے۔

اتنے میں وردہ چائے لے کر داخل ہوئی۔ اس نے آخری فقرہ سن لیا۔ ''سب سے پہلے تو ڈاکٹر صاحب کی شادی کریں۔ رشتہ موجود ہے۔ اس کے بعد ان کو یہ ذمہ داری دیں تاکہ یہ تسلی سے دوسروں کی خدمت کر سکیں۔''

''آپ دونوں سے مل کر مجھے یوں لگ رہا ہے کہ میں اپنے خاندان میں آ گیا ہوں۔ ڈاکٹر ساجد نے جاب دیدی اور آپ نے میرا گھر آباد کرنے کی نوید دی۔ اور انعم بچوں کے ساتھ خوش ہوگئی۔ آپ دونوں تو سراسر رحمت ہیں۔ یہ کلینک ضرور چلے گا بلکہ دوڑے گا۔''

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ ''جی ڈاکٹر وردہ ہیں میں فرحت عبداللہ۔''

''کہو کیسی ہو میں ہی بول رہی ہوں۔''

''اگر آپ کل فارغ ہوں تو دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔''

''مگر ہمارے ساتھ ایک مہمان بھی ہوگا۔ اس کو آنے کی اجازت ہے؟''

''جی بسم اللہ آپ کے دس مہمان ہمارے سر آنکھوں پر ضرور آیئے گا ہم سب منتظر ہیں۔''

فرحت کے گھر سب کھانے کی میز پر تھے جب وردہ نے ڈاکٹر ذوالقرنین اور فرحت کی شادی کی بات کی۔ اس کی امی بولیں۔ ''آپ کی بہن ہے جو بھی کریں گی اس کی بہتری کیلئے، ہم تو چراغ سحری ہیں۔ آج بجھے کل دوسرا دن۔''

''بہت بہت شکریہ مجھے یہی امید تھی۔ آپ مایوسی کی باتیں نہ کریں ابھی ہم سب کو آپ کی ضرورت ہے۔''

ڈاکٹر ساجد نے بتایا کہ فی الحال ڈاکٹر صاحب ہمارے پاس ٹھہریں گے۔ ہمارا گھر بہت بڑا ہے اوپر والا پورشن خالی پڑا ہے۔ فرحت رخصت ہو کر ادھر ہی جائیں گی اس نیک کام کیلئے اگلا اتوار ٹھیک رہے گا۔

''آپ اچھی طرح سوچ لیں۔''..... آمنہ بولی۔ ''تیاری کیلئے یہ

وقت بہت کم ہے۔ پہلے رباب کیلئے اتنی جلدی کی۔ ہمارے بھی تو کچھ ارمان ہیں۔''

''ڈاکٹر صاحب کو کچھ جہیز کے نام پر نہیں چاہیے۔ باقی ہم تمہاری اور سعدیہ کی دفعہ سارے ارمان پورے کریں گے وعدہ ہم صرف چار لوگ ہوں گے۔ یہاں نکاح ہوگا۔ اور کھانا باہر سے منگوالیں گے۔ زیور اور جوڑا آپ خود خرید لیں۔ پے منٹ ہو جائے گی۔ بعد میں یہ اپنی مرضی سے شاپنگ کر لے گی۔''

''لیکن ضرورت کا سامان؟'' اس کی امی بولیں۔

''ہمارا اوپر والا پورشن فرنشڈ ہے جو مہمان آتے ہیں وہاں ہی ٹھہرتے ہیں۔''

نذیر پیرزادہ نے اٹھ کر دونوں کو باری باری گلے لگایا اور بولے ''ڈاکٹر ساجد.....آپ انسان نہیں فرشتہ ہیں۔ میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں۔''

''بس آپ دعا کریں فرحت ہماری مریضہ تھی اب ہماری بہن ہے۔''

اگلے ہفتے سادگی سے نکاح ہو کر فرحت ڈاکٹر وردہ کے گھر آ گئی۔ دونوں بہت خوش تھیں۔ انعم کو بچے مل گئے۔ وردہ کو ایک پیاری دوست اور بہن مل گئی۔ سوشل کلینک بھی کھل گیا۔ لوگ آنے لگے اور مسائل چاروں بیٹھ کر حل کرنے لگے۔ ڈاکٹر وردہ کو پتہ چلا کہ فرحت زبردست خوبیوں کی حامل تھی۔ اس طویل آزمائش نے سونے کو کندن بنا دیا تھا۔

ذوالقرنین نے فرحت سے کہا۔ ''مجھے زیادہ معلوم نہیں لیکن میں کوشش کروں گا کہ گزری ہوئی مشکلات کا سایہ آپ پر نہ پڑے۔ میرے ہاتھ خالی ہیں لیکن میں خود اپنے دل سمیت آپ کے حضور حاضر ہوں۔''

اس نے شرم سے سر جھکا لیا۔

ولیمے کے دن ڈاکٹر وردہ نے فرحت سے کہا ''تمہاری اتنی ساری بیماریوں کیلئے ایک فل ٹائم ڈاکٹر چاہیے تھا نا.....اب ٹھیک ہے۔''

اور جواباً وہ بس شرمیلی ہنسی ہنس دی اور آنکھوں سے نمی صاف کرنے لگی۔

☆.....☆.....☆

ربیعہ ندرت

کوئی ہے جو مجھے روکے!

سعد اور ذیشان کبھی اکٹھے بیٹھ کر باتیں کرتے، ایک دوسرے سے کھیلتے اور کبھی آپس میں الجھ جاتے۔ ایسے موقعوں پر صابرہ خاتون دونوں کو الگ کر دیتیں اور ذیشان کو سمجھاتیں، کبھی اسے سرزنش کرتیں کبھی ہلکی پھلکی ڈانٹ پلا دیتیں، کیونکہ سعد کی معذوری کی وجہ سے ان کے دل میں اس کے لئے نرم گوشہ تھا۔ شمسہ عموماً خاموش رہتی یا سعد کو گود میں اٹھا کر اپنے کمرے میں لے جاتی البتہ صابرہ خاتون کی یہ طرفداری غزالہ کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی وہ چلا کر ذیشان سے کہتی۔

''بیٹا کئی دفعہ تمہیں سمجھایا ہے کہ اس کے ساتھ نہ کھیلا کرو وہ زیادتی بھی کرتا ہے تو بھی دادی تمہیں ڈانٹتی ہے۔ وہ اندھا ہے اور اس معذوری کا اسے ناجائز فائدہ ہو جاتا ہے۔''

بظاہر تو وہ یہ بات ذیشان سے کرتی تھی لیکن درحقیقت اس کی مخاطب صابرہ خاتون اور شمسہ ہوتی تھیں۔

غزالہ کے یہ الفاظ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح صابرہ خاتون کے کانوں میں انڈیلے جاتے تھے لیکن وہ اپنی زبان کو دانتوں تلے دبا لیتی تھیں۔ مبادا گھر میں ہنگامہ برپا ہو جائے اور اس گھر کے امن کا وہ پھریرا جو صابرہ خاتون اپنی چادر کی بکل میں چھپائے ہوئے تھیں اس ہنگامے کی نذر ہو جائے۔ وہ جانتی تھیں کہ امن قائم رکھنے کیلئے قربانیاں دینا پڑتی ہیں، دکھ برداشت کرنے پڑتے ہیں، جبر سہنا پڑتا ہے، زبان بندی کرنا پڑتی ہے تب کہیں جا کر گھر کے آنگن میں امن کا پرندہ بسیرا کرتا ہے لیکن جونہی گھر کے اطراف سے شور و غوغا، دنگا فساد اور مخالفت برائے مخالفت کا آوازہ بلند ہوتا ہے یہ پرندہ فوراً اڑان بھر کر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

غزالہ نے منیر صاحب کو بھی کہہ دیا تھا کہ وہ ان کیلئے کوئی اچھا گھر تلاش کرنے میں ان کی مدد کریں۔ منیر صاحب نے چند پراپرٹی ڈیلروں سے اس سلسلہ میں رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ جلد ہی انہیں ایک گھر پسند آ گیا۔ اس کا رقبہ ڈیڑھ کنال کے لگ بھگ تھا۔ نقشہ بھی اچھا تھا۔ گھر کا مالک اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان چھوڑ کر آسٹریلیا میں مستقل آباد ہونے کیلئے جا رہا تھا۔ اسے گھر بیچنے کی جلدی تھی۔ اس لئے وہ مارکیٹ کی نسبت قدرے سستے داموں گھر فروخت کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اس گھر کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ منیر صاحب کے گھر سے بہت قریب تھا۔ غزالہ اور شوکت کو بھی گھر بہت پسند آیا تھا۔ چنانچہ شوکت نے اس کا سودا طے کر کے رقم کی ادائیگی کر دی تھی۔ صابرہ خاتون اور لیاقت اس بات سے لاعلم تھے۔ غزالہ کیلئے اپنی اس خوشی کو سمونا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ جلد از جلد نئے گھر میں شفٹ ہونا چاہتی تھی۔ لیکن شوکت کچھ تو دفتر کے کاموں میں بے حد مصروف تھا اور کچھ یہ اعلان کرتے ہوئے اس کی زبان رک جاتی تھی۔ ابھی تک اس نے بھاجی سے اس موضوع پر بات نہیں کی تھی۔ جب غزالہ کا اصرار بڑھا تو شوکت نے ان کو اطلاع دینے کا ارادہ کر لیا۔

عالیہ کو سکول سے چھٹی تھی۔ شمسہ عالیہ اور سعد کو ساتھ لے کر اپنی بہن کے ہاں چلی گئی۔ وہ سارا دن وہاں گزارنا چاہ رہی تھی۔ لیاقت انہیں وہاں چھوڑ کر واپس آ گیا تھا۔ شوکت ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ لیکن اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بات کیسے شروع کرے اور کہاں سے شروع کرے۔ وہ اسی سوچ میں گم تھا کہ لیاقت کہنے لگا۔ ''میں کافی عرصہ سے سوچ رہا تھا کہ گھر کے اوپر کی منزل میں ایک چھوٹا سا کچن بنوا دوں تاکہ غزالہ کو سہولت ہو جائے۔ وہ چائے یا کافی بنانا چاہے تو اسے بار بار نیچے نہ اترنا پڑے لیکن گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے میرے لئے یہ ممکن نہ

ہوسکا۔تمہارے لئے اب یہ کام کروانا مشکل نہیں۔ جب بھی ممکن ہو کام شروع کروادو۔''

شوکت نے کہا۔''بھاجی! اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ کیونکہ میں نے غزالہ کی سہولت کیلئے الگ گھر خرید لیا ہے اور بہت جلد ہم وہاں شفٹ ہو جائیں گے۔ یہ گھر ہمارے لئے کافی تھا لیکن اب بچوں کے ساتھ غزالہ کو یہاں تنگی کا احساس ہوتا ہے۔''

شوکت کی بات سن کر لیاقت کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا وجود سن ہو کر رہ گیا ہو۔ وہ شوکت کو روکنا چاہتا تھا لیکن اسے اپنے جذبات کے اظہار کیلئے الفاظ نہیں مل رہے تھے چند لمحے وہ چپ رہا پھر کہنے لگا۔

''آج مجھ پر ایک احسان کرو۔ ماں جی کی زندگی تک جیسے تیسے اسی گھر میں گزارا کرلو۔ وہ بوڑھی اور کمزور جان شاید اس گھر کے انسانوں کی تقسیم کو برداشت نہ کر پائے۔ غزالہ کو پیار سے سمجھا دو کہ وہ مزید کچھ عرصہ گزار لے دل میں جگہ ہو جائے گی تو گھر میں بھی گنجائش نکل آئے گی۔ دیکھو شمسہ نے کبھی مجھ سے اس تنگی کا ذکر نہیں کیا۔ وہ گزارا کر سکتی ہے تو غزالہ کیلئے بھی چنداں مشکل نہ ہوگی۔''

لیاقت کی بات سن کر شوکت بھڑک اٹھا۔ کہنے لگا۔''بھاجی! آپ کا کہنا بجا ہے بھاجی اس گھر میں بخوبی گزارا کر سکتی ہیں۔ یہاں ان کو تنگی کا کبھی احساس نہیں ہوگا کیونکہ وہ ایک عام سکول ماسٹر کی بیٹی ہیں۔ انہوں نے زندگی کی سہولتوں کے مزے کبھی نہیں اٹھائے جبکہ غزالہ نے ایسے گھر میں آنکھ کھولی ہے جو بھاجی کے خواب میں بھی نہیں آسکتا۔ آپ بھاجی اور غزالہ کے ماضی کے حالات پر غور کریں گے تو بات خود ہی آپ کی سمجھ میں آجائے گی۔ غزالہ نے صبر و تحمل سے بہت انتظار کرلیا ہے اب میں اسے مزید آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا۔''

صابرہ خاتون ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ شوکت کی باتیں سن کر وہ سناٹے میں آگئیں۔ شوکت وہاں سے اٹھ کر صابرہ خاتون کے پاس آکر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

''ماں جی میری خواہش ہے کہ آپ میرے ساتھ میرے نئے گھر میں رہیں۔ وہاں آپ کو بہت آرام اور سہولت رہے گی۔ کہیے آپ کیا کہتی ہیں؟'' صابرہ خاتون کے جواب دینے سے پہلے ہی لیاقت بول اٹھا کہ''ماں جی کو میں ہرگز نہ جانے دوں گا۔ وہ اس گھر کا حصہ ہیں۔ وہ یہیں رہیں گی۔''

صابرہ خاتون گم صم خالی خالی نظروں سے دونوں کو دیکھتی جا رہی تھیں۔ شوکت کہنے لگا۔''بھاجی مجھے اس بات کا جواب آپ سے نہیں ماں جی سے چاہیے۔ میں نے سوال ان سے کیا ہے آپ سے نہیں۔ آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ وہ صرف آپ کی ماں ہیں اور ان پر صرف آپ کا حق ہے۔''

یہ کہہ کر وہ صابرہ خاتون کی طرف مڑا اور کہنے لگا۔''ماں جی میں آپ کا فیصلہ سننا چاہتا ہوں کیا آپ میرے ساتھ چلنے کیلئے تیار ہیں؟''

صابرہ خاتون نے ایک نظر لیاقت کو دیکھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا، اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ لیاقت کو دیکھ کر ان کے دل نے فوراً وہ فیصلہ کر دیا جس کے لئے ان کے ذہن میں کشمکش جاری تھی۔ وہ کہنے لگیں۔

''شوکت بھلا میں تمہارے ساتھ کیسے رہ سکتی ہوں۔ میں خود ایک غریب مزارع کی بیٹی ہوں۔ جو گھر میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا ہو وہاں حقیقت میں زندگی بسر کرنا میرے لئے مشکل ہے۔ تم جہاں رہنا چاہو چلے جاؤ۔ میرا جینا مرنا لیاقت کے ساتھ ہے۔''

صابرہ خاتون کے فیصلے کو سن کر شوکت کے سر سے بوجھ اتر گیا۔ اس کا فرض تھا کہ وہ ان کو اپنے ساتھ رہنے کی پیشکش کرے۔ سو اس نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ ماں جی نے اگر اس کی پیشکش کو سوچے سمجھے بغیر مسترد کر دیا تھا تو وہ خود نتائج کی ذمہ دار تھیں انہوں نے خود ہی نا آسودہ زندگی کو پر آسائش زندگی پر ترجیح دی تھی۔

شوکت اپنے کمرے میں آیا تو غزالہ کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ وہ الماری میں سے چیزیں نکال کر پیک کر رہی تھی۔ شوکت کو دیکھتے ہی اس نے پوچھا کہ''کیا ہم ابھی شفٹ کر سکتے ہیں؟'' شوکت نے کہا۔''نہیں ابھی شام ہو رہی ہے۔ کل صبح کیلئے یہ کام اٹھا رکھو۔ صبح

سویرے میں کرایہ پر ٹرک لے آؤں گا اور اپنا سامان اس پر لاد کر چل دیں گے۔''

شمسہ بہن کے گھر سے واپس آئی تو گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ ماں جی صحن کے کونے میں رکھی ہوئی چوکی پر مصلا بچھا کر بیٹھی تھیں۔ شمسہ کو دیکھتے ہی انہوں نے نظریں جھکا لیں اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تسبیح کے دانے تیزی سے چلانے شروع کر دیئے۔ شمسہ کو یوں محسوس ہوا جیسے ان کی آنکھوں میں آج اپنائیت اور محبت کے ساتھ ساتھ ندامت کے سائے بھی امڈ آئے ہیں۔ شوکت صحن کے دوسرے کونے میں کرسی بچھا کر اخبار کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ شمسہ کی آہٹ سن کر اس نے گردن گھما کر ایک نظر اس کو دیکھا اور کچھ کہے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ آج شوکت کی آنکھوں میں اجنبیت جھلک رہی تھی۔ وہ حیران تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں کیا ماجرا ہوا ہے۔ یہی سوچتے سوچتے وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو لیاقت اپنے بستر پر لیٹا چھت کو ایک ٹک گھور رہا تھا۔ اس نے شمسہ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہو اور اِدھر اُدھر دیکھنے کی وجہ سے سوچ کا یہ سلسلہ ٹوٹنے کا ڈر ہو۔ شمسہ نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا دیکھ رہے ہیں آپ چھت پر؟''

لیاقت کہنے لگا۔ ''کچھ نہیں پنکھے کو دیکھ رہا ہوں۔ بہت پرانا ہو گیا ہے اس کی رفتار بھی دھیمی ہو گئی ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ اس دفعہ گرمی کا موسم شروع ہونے سے پہلے ہی بدل ڈالوں۔''

شمسہ کہنے لگی۔ ''خواہ مخواہ پنکھا بدلنے کا سوچ رہے ہو۔ ابھی تو اچھا بھلا ہے۔ جب تک گزارا چلتا ہے چلاؤ۔''

لیاقت بولا..... ''سوچا میں نے بھی یہی تھا کہ جب تک گزارا چلتا ہے چلاؤ لیکن اب مشکل ہے شمسہ نے کہا..... ارے چھوڑو۔ ابھی تو موسم بھی شروع نہیں ہوا اور تم کن سوچوں میں گم ہو گئے۔''

لیاقت نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور چپ چاپ لیٹا رہا۔ شمسہ کو اس کی خاموشی سے وحشت سی ہونے لگی اور وہ آ کر صابرہ خاتون کے پاس چوکی پر بیٹھ گئی۔ خلاف معمول وہ بھی خاموش تھیں آخر شمسہ سے نہ رہا گیا اور اس نے ان سے پوچھ ہی لیا۔

''کیا بات ہے۔ سب لوگ چپ چپ کیوں ہیں۔ خیر تو ہے نہ۔''

شمسہ کا پوچھنا تھا کہ صابرہ خاتون کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ کہنے لگیں۔''

بیٹی خیر ہی تو نہیں ہے۔ شوکت نے الگ گھر خرید لیا ہے۔ وہ غزالہ اور ذیشان کو لے کر وہاں شفٹ کر جائے گا۔'' یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگیں۔

شمسہ نے ان کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''ماں جی! اس میں بھلا رونے کی کیا بات ہے۔ گھر جدا ہو جائیں تو کوئی بات نہیں بس دل جڑے رہیں تو کوئی مسئلہ نہیں پھر شوکت کا گھر بھی تو ہم سب کا گھر ہے۔ ہم سب وہاں بھی جایا کریں گے وہ بھی آتے جاتے رہیں گے۔ شہر ایک ہو تو پھر دوریاں کیسی۔'' صابرہ خاتون روتے روتے کہنے لگیں۔

''بیٹی دل جڑے رہتے تو میں کاہے کو روتی۔ رونا تو اسی بات کا ہے کہ پہلے دل الگ ہوتے ہیں اور پھر اس کے بعد گھر الگ ہونے کی نوبت آتی ہے۔ میں نے لیاقت اور شوکت کو ہمیشہ دو جان یک قالب سمجھا تھا لیکن.....''

ان کی آواز فرطِ جذبات سے رندھ گئی۔ شمسہ نے کہا ''ماں جی! آپ کو ان کے دلوں کے الگ ہونے کی کیا خبر..... دل تو گہرے سمندروں کی مانند ہیں۔ ان کی تہوں کا بھید بھلا کس نے پایا ہے۔''

صابرہ خاتون کہنے لگیں۔ ''بیٹی دلوں میں فرق آ جائے، یا دل ٹوٹ جائیں یا بکھر جائیں یا باہم چلتے چلتے الگ ہو جائیں تو کوئی صدا نہیں آتی، کوئی ہنگامہ برپا نہیں ہوتا، کوئی شور نہیں اٹھتا بس یہ کیفیت محسوس ہو جاتی ہے۔''

شمسہ نے دل میں سوچا کہ اب بھلا ماں جی کو کون سمجھائے کہ دل جغرافیائی حدود اور زمینی فاصلوں سے ماورا ہوتے ہیں۔ بعض اوقات لاکھوں میل دور رہنے سہنے والے لوگوں کے دل ہم آہنگ ہوتے ہیں ایک دل میں ٹیس اٹھتی ہے تو چبھن دوسرے دل کو بھی محسوس ہوتی ہے۔ ایک

دل جلتا ہے تو دھواں دوسرے دل سے بھی اٹھتا ہے۔ایک دل مسرور ہوتا ہے تو دوسرا دل بھی خوشی سے سرشار ہو جاتا ہے۔ایک دل میں راحت کی کرن پھوٹتی ہے تو دوسرا دل بھی منور ہو جاتا ہے۔ اتنے فاصلوں کے باوجود ایسے دل ایک ساتھ دھڑکتے ہیں۔لیکن بعض اوقات ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے بھی انسانوں کے دل ایک دوسرے سے بے خبر رہتے ہیں ان کے دلوں کے درمیان پردہ آ جاتا ہے، ایک آڑ سی آ جاتی ہے ان کے بیچ دیوار کھڑی ہو جاتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ دیوار بلند سے بلند تر ہوتی چلی جاتی ہے اور بالآخر نا قابلِ مجبور ہو جاتی ہے۔

دوسرے دن صبح شوکت ٹرک اور مزدور لے آیا۔ اس نے اپنا سامان ٹرک پر لادا غزالہ اور ذیشان کو ہمراہ لیا اور سب کو خدا حافظ کہہ کے رخصت ہو گیا۔ان کے رخصت ہونے کے بعد گھر پر عجیب سا سناٹا مسلط ہو گیا۔گھر میں صابرہ خاتون، لیاقت اور شمسہ کے دل غم سے بوجھل تھے لیکن سب کی زبانیں گویا گنگ ہو کر رہ گئی تھیں۔غزالہ نے کچھ سامان ردی سمجھ کر وہیں چھوڑ دیا تھا گھر میں جا بجا وہ سامان اور کاغذ بکھرے پڑے تھے۔ایسا لگتا تھا جیسے کوئی شدید آندھی آ کر اور اپنے نشانات ثبت کر کے گزر گئی ہو۔ کچھ دیر کے بعد شمسہ نے اٹھ کر بکھرے ہوئے سامان کو ٹھکانے لگا دیا اور گھر صاف کر دیا۔

غزالہ اپنے نئے گھر میں بہت خوش تھی۔ یہ گھر اس کے تصور اور خواب سے بڑھ کر خوبصورت اور آرام دہ تھا۔لیکن اتنے بڑے گھر کی تزئین و آرائش بھلا کوئی آسان کام تھا۔وہ صبح سے شام تک مصروف رہتی تب کہیں جا کر گھر کا ایک کونہ سنور پاتا۔عجیب بات یہ تھی کہ صابرہ خاتون کے گھر میں اس پرستی چھائی رہتی۔کوئی کام کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔لیکن یہاں آ کر گویا جسم میں بجلی کی لو دوڑ گئی تھی کام تھے کہ ختم نہیں ہوتے تھے۔ وقت تھا کہ پر لگا کر اڑ رہا تھا۔ پلک جھپکتے میں دن بیت جاتا۔شوق تھا کہ بڑھتا چلا جا رہا تھا ہمت تھی کہ جواں تھی۔اس مصروفیت کا اپنا ہی مزہ تھا۔

''ڈیڑھ دو ماہ کی ان تھک محنت کے بعد گھر کی نوک پلک سلور گئی تھی۔کونہ کونہ غزالہ کے حسنِ ذوق کی گواہی دے رہا تھا۔لان میں سرسبز گھاس بچھ گئی تھی۔ جا بجا گملوں میں خوبصورت پودے لہلہاتے رہے تھے۔شوکت تو پہلے ہی غزالہ کی صلاحیتوں کا معترف تھا۔گھر کی آرائش کو دیکھ کر اور بھی معتقد ہو گیا۔اب غزالہ نے اپنے دوست اور احباب رشتہ داروں کو اپنے گھر مدعو کیا۔شوکت جا کر صابرہ خاتون کو بھی دعوت دے آیا۔صابرہ خاتون کا خیال تھا کہ شوکت کے ساتھ غزالہ کو بھی آنا چاہیے تھا۔ چونکہ وہ نہیں آئی تھی اس لئے وہ بھی وہاں جانے سے گریزاں تھیں لیکن لیاقت کے اصرار کی وجہ سے وہ رضامند ہو گئیں۔لیاقت بازار سے ذیشان کیلئے کچھ کھلونے اور غزالہ کا سوٹ خرید کر لے آیا تھا۔مقررہ دن شوکت کار پر آ کر ان سب کو اپنے ساتھ لے گیا۔

گھر کے اندر داخل ہوتے ہی صابرہ خاتون ہکا بکا رہ گئیں۔واقعی اتنا خوبصورت گھر انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔گھر کیا تھا گویا طلسم کدہ تھا۔صابرہ خاتون دائیں بائیں دیکھتی ہوئی بہت ہولے ہولے قدم اٹھا رہی تھیں۔مبادا یہ طلسم ٹوٹ نہ جائے۔غزالہ نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا اور انہیں ڈرائنگ روم میں لے گئی۔وہاں اور بھی بہت سے مہمان بیٹھے تھے۔ صابرہ خاتون، شمسہ سعد اور عالیہ ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد گھر کی ملازمہ ایک ٹرے میں مشروبات لے کر آئی اور سب کے سامنے باری باری پیش کرنے لگی۔ جب اس نے ٹرے سعد کی طرف بڑھائی تو غزالہ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''بشیراں۔ ذرا دھیان سے گلاس خود بچے کے ہاتھ میں دے دو۔ یہ بچہ بے چارہ اندھا ہے۔ایسا نہ ہو کہ مشروب قالین پر گر جائے نیا قالین ہے خراب ہو جائے گا۔''

غزالہ کی آواز سن کر سب مہمانوں نے گردن گھما کر سعد کو دیکھا ان کی نظروں میں سعد کیلئے حیرت اور ہمدردی کے جذبات تھے۔صابرہ خاتون سے سعد کی یہ توہین برداشت نہ ہوئی وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھ گئیں اور شمسہ سے کہا۔

''اٹھو ہم واپس جائیں گے۔ ابھی اور اسی وقت۔'' یہ کہہ کر وہ ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئیں۔

شمسہ، عالیہ، سعد اور لیاقت بھی ان کے پیچھے چل پڑے۔ باہر نکل کر لیاقت نے ان سے کہا۔

''ماں جی! ہمیں ایسے واپس نہیں جانا چاہیے۔ بدمزگی ہو جائے گی۔''

شوکت بھی تیز تیز قدم اٹھاتا ان کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ماں جی ''کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ برا ماننے کی کیا بات ہے۔ آپ نے سب مہمانوں کے سامنے ہماری بے عزتی کی ہے۔ آپ نے ہمارے رنگ میں بھنگ ڈالی ہے۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

لیکن صابرہ خاتون نے سنی ان سنی کر دی اور گھر سے باہر نکل گئیں۔ سارا راستہ سب لوگ یوں چپ رہے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ گھر پہنچ کر صابرہ خاتون گم صم تخت پر آ کر بیٹھ گئیں۔ شمسہ بھی ان کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ صابرہ خاتون نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا اور کہنے لگیں۔

''نہ رو میری دھی۔ تو نہ رو۔ تو روتی ہے تو میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ تو کاہے کو پریشان ہوتی ہے۔ اللہ پر بھروسہ رکھ۔ اسی سے مانگ، اسی کے در پر دستک دے۔ وہ تجھے کبھی مایوس نہیں کرے گا۔ کیا ہوا اگر سعد نظر سے محروم ہے۔ وہ اپنے خالق کی نظر میں ہے۔ اور جو اس کی نظر میں ہو وہ بھلا محروم کیسے رہ سکتا ہے''

صابرہ خاتون کی باتوں نے جادو کا سا اثر دکھایا اور شمسہ کے وجود میں پھر سے امید اور حوصلے کے دیئے جلنے لگے۔

شمسہ نے محسوس کیا کہ سعد کا حافظہ بلا کا ہے۔ جو بات اسے ایک دفعہ بتا دی جاتی وہ فوراً اسے ازبر ہو جاتی تھی۔ چنانچہ اس نے لیاقت کے مشورے سے اسے محلے کی مسجد کے امام صاحب کے پاس قرآن حفظ کرنے کیلئے بھیجنا شروع کر دیا۔ امام صاحب خود بھی نابینا تھے۔ ان کی بیوی وفات پا چکی تھی۔ ان کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹا سکول میں پڑھ رہا تھا اور بیٹی ان کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ وہ مسجد سے ملحقہ ایک چھوٹے سے کوارٹر میں مقیم تھے۔ شمسہ روزانہ خود سعد کو مسجد لے کر جاتی اور واپس لاتی۔ سعد نے بہت شوق اور محنت سے دو سال کے عرصہ میں قرآن حفظ کر لیا۔

لیاقت شام کو باقاعدگی سے کلینک جاتا تھا۔ وہاں جب ڈاکٹر صاحب کو سعد کے بارے میں پتہ چلا تو انہوں نے لیاقت کو مشورہ دیا کہ وہ اسے نابینا بچوں کے سکول میں داخل کروا دے۔ انہوں نے اسکے تمام اخراجات اٹھانے کی پیشکش بھی کی۔ چنانچہ لیاقت نے سعد کو سکول میں داخل کروا دیا۔ سعد کو پڑھنے کیلئے ابھرے ہوئے الفاظ کے ساتھ مرتب کردہ کتابیں مل گئیں۔ وہ روزانہ صبح سکول چلا جاتا اور شام کو امام صاحب کے پاس حفظ شدہ قرآن کا سبق دھرانے کیلئے جاتا۔

رات کو جب وہ سکول کا ہوم ورک کرنے کیلئے بیٹھتا تو عالیہ اس کے پاس آ کر بیٹھ جاتی اور اس کی مدد کرتی۔ ہوم ورک مکمل ہو جاتا تو عالیہ اسے نیا سبق سنا کر تفصیل سے سمجھاتی۔ سعد بہت توجہ اور آسانی سے اسے ذہن نشین کر لیتا۔ سکول میں بھی اس کی کارکردگی نمایاں تھی۔ صابرہ خاتون کی دعاؤں اور امیدوں کا مرکز و محور سعد تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے اس کی بلائیں لیتی تھیں۔

غزالہ کے ہاں دوسرے بیٹے نے جنم لیا۔ غزالہ نے اس کا نام معظم رکھا۔ چھوٹے بچے کی وجہ سے غزالہ کی مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی۔ عام طور پر اسے شمسہ اور صابرہ خاتون کی یاد نہیں آتی تھی لیکن کبھی کبھار ان کا خیال آ بھی جاتا تو وہ اسے اپنے ذہن سے جھٹک کر اپنی نامکمل خواہشات کی تکمیل کے منصوبے بنانے میں مصروف ہو جاتی۔

وقت گزرتا رہا۔ سعد نے میٹرک امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا جبکہ ذیشان دو مضمونوں میں فیل ہو گیا۔ دراصل ماں کے بے جا لاڈ پیار اور دولت کی ریل پیل کی وجہ سے ذیشان کی توجہ پڑھائی سے ہٹ کر دوسری دلچسپیوں کی طرف مرکوز ہو کر رہ گئی تھی۔ غزالہ کو اس کی کمزوریوں کا اندازہ تھا لیکن اس کی نظر میں اس کی خامیاں بھی خوبیوں کا روپ دھار لیتی تھیں۔ وہ اس کی ہر غلطی کیلئے کوئی نہ کوئی جواز ڈھونڈ نکالتی اور پھر اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتی کہ ذیشان کوئی عام لڑکا تو نہیں کہ اسے عام معیار سے جانچا جائے۔ وہ تو بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ باپ کے مال و دولت اور جائیداد کا وارث۔ تعلیم اس کی مجبوری نہیں وقت آنے پر وہ کوئی

فیکٹری بنالے گا یا بزنس شروع کر دے گا۔ اس کے لئے روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں اور جس کے پاس دولت ہو اسے کامیابی کے دروازے پر دستک نہیں دینا پڑتی بلکہ کامیابی خود آ کر اس کے قدم چومتی ہے۔

شوکت کی کاروباری مصروفیات بہت بڑھ چکی تھیں۔ اسے کئی کئی ماہ تک صابرہ خاتون کا خیال نہیں آتا تھا لیکن کچھ عرصہ گزرنے کے بعد صابرہ خاتون دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے فون کر کے بلاتیں۔ تب وہ چار و ناچار ان سے ملنے کیلئے چلا جاتا۔ چند گھڑیاں ان کے پاس بیٹھتا، رسمی جملے ادا کرتا اور یوں اپنا فرض ادا کر کے واپس لوٹ جاتا۔ اس کے جانے کے بعد صابرہ خاتون کو چپ سی لگ جاتی۔ وہ گھنٹوں خلا میں گھورتی رہتیں اور دل ہی دل میں یہ سوچتی چلی جاتیں کہ یہ میرے لئے زادِراہ بن کر میرے مددگار بن گئے ہیں۔''

شوکت اس شوکت سے کتنا مختلف ہے جو ان کی گود میں کھیل کر پروان چڑھا تھا۔ جو بچپن میں اپنے باپ کے کندھوں پر سوار ہو جایا کرتا تھا۔ جس نے بھاجی کی انگلی پکڑ کر جوانی کی منزلیں طے کی تھیں۔ ان کا اپنا شوکت اب ان کے لئے اجنبی بنتا جا رہا تھا۔ اس کی نظریں، اس کے خیالات، اس کا لب و لہجہ، اس کے معیار، اس کی منزلیں، اس کی ترجیحات، اس کی چاہتیں غرض سب کچھ بدل چکا تھا اور انہیں شوکت کا یہ نیا روپ تکلیف دیتا تھا۔ یوں شوکت سے جدائی بھی ان کے لئے اذیت کا باعث تھی لیکن اس سے ملاقات کر کے وہ اور بھی بے سکون ہو جاتی تھیں۔

سعد نے میٹرک کر لیا تو لیاقت نے کالج میں اس کے داخلہ کی کوشش شروع کر دی۔ لیکن اسے یہ جان کر بے حد مایوسی ہوئی کہ کالج کی سطح پر نابینا بچوں کیلئے سلیبس کی کتابیں مخصوص طباعت کے ساتھ ناپید ہیں۔ لیاقت نے جب گھر آ کر یہ خبر دی تو شمسہ پر گویا بجلی گر پڑی۔ سعد کی غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے اس نے سعد سے بڑی امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ لیکن اب اسے احساس ہوا کہ اس کی خواہش کے راستے پر کیسے کیسے کانٹے بکھرے پڑے تھے۔ کیسی کیسی رکاوٹیں تھیں۔ سعد کو جب صورتحال کا علم ہوا تو چند لمحوں کیلئے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر کہنے لگا۔

''ابو آپ مجھے سلیبس کی کتابیں لا دیجئے۔ عالیہ روزانہ ان میں سے اسباق پڑھ کر سنایا کرے گی اور میں انہیں یاد کر لیا کروں گا۔ میں بطور پرائیویٹ امیدوار امتحان دوں گا۔ مجھے پڑھنا ہے، مجھے آگے بڑھنا ہے۔ گو میری آنکھوں پر اندھیرے کے گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی میری منزل میری نظروں کے سامنے روشن ہے۔ میری منزل مجھے پکارتی ہے میری بینائی میرے راستے کی رکاوٹ نہیں، بلکہ آپ سب کی دعائیں اور میرا ارادہ ہیں۔ شمسہ صابرہ خاتون کے پاس چوکی پر گم صم بیٹھی تھی۔ سعد کی مضبوط اور پرعزم آواز سن کر وہ چونک گئی۔ پھر اس کی محتاجی کو محسوس کر کے اس کی آنکھیں بھر آئیں اور اس کے گالوں پر موٹے موٹے آنسو بہنے لگے۔ صابرہ خاتون نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا اور کہنے لگیں۔

''نہ رو میری بچی، نہ رو میری جان، تو کیوں اپنے آپ کو ہلکان کرتی ہے تو سمجھتی ہے کہ سعد کی آنکھوں کے اندھیرے اس کے راستے کی دیوار ہیں۔ تو سمجھتی ہے کہ اس کے معاملے میں ہم بھی بے بس ہیں۔ ارے پگلی! کیا تو نہیں جانتی کہ جس نے اسے پیدا کیا، اسے پروان چڑھایا، وہ بے بس نہیں۔ اسے وسائل کی ضرورت ہے نہ اسباب کی۔ اس کی چاہت سے اندھیرے اجالوں میں بدل جاتے ہیں۔ اسی پر بھروسہ رکھ، اسی سے مانگ، اسی کے در پر دستک دے۔ وہ ضرور سعد کیلئے ایسے اسباب پیدا کرے گا کہ منزل خود چل کر اس کے پاس آئے گی۔''

شمسہ نے سر اٹھا کر صابرہ خاتون کی آنکھوں میں جھانکا وہاں امید اور یقین کی شمع روشن تھی۔ ان کو دیکھ کر شمسہ کو بھی قدرے سکون کا احساس ہو گیا۔

عالیہ کی بھرپور توجہ پا کر سعد محنت اور شوق سے پڑھتا رہا۔ ہر سال امتحان کے موقع پر سعد کی طرف سے تعلیمی بورڈ کو درخواست دے دی جاتی چنانچہ تعلیمی بورڈ والے سعد کیلئے خصوصی انتظامات کر کے اسے ایک ترجمان کی سہولت مہیا کر دیتے۔ وہ ترجمان پرچہ سوالات میں سے سوال پڑھ کر سعد کو سناتا اور پھر سعد کی زبانی ان کے جوابات ریکارڈ کر لیتا۔ اس

طرح سعد بآسانی امتحانات میں شریک ہوتا رہا اور حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کرتا رہا۔ ماسٹرز کر لینے کے بعد سعد نے کمپیوٹر کا کورس بھی مکمل کر لیا۔ صابرہ خاتون کی کمر جھک کر دوہری ہوگئی تھی۔ ان کی عینک کے شیشے اب بہت موٹے اور بھاری ہو گئے تھے۔ ان کی آواز میں بھی پہلے جیسا دم خم نہیں تھا۔ وہ چلنے پھرنے میں بھی دقت محسوس کرتی تھیں۔ لیاقت بھی ریلوے کے محکمے سے ریٹائر ہوگیا تھا۔ البتہ شام کو وہ ڈاکٹر صاحب کے کلینک پر باقاعدگی سے جاتا تھا۔ شمسہ کے سر کے بالوں میں جابجا چاندی جھلکنے لگی تھی۔ عالیہ بھی اپنے گھر سدھار چکی تھی۔

سعد اب نوکری کیلئے سرگرداں تھا۔ لیاقت نے اس کی طرف سے کئی اداروں میں درخواستیں لکھ کر بھیجی تھیں لیکن کہیں شنوائی نہ ہوئی۔ ایک دو جگہ سے انٹرویو کیلئے بلاوا آیا تو لیاقت اسے لے کر متعلقہ ادارے میں پہنچ گیا لیکن بات نہ بنی۔ سعد بار بار صابرہ خاتون کے پاس آ کر چوکی پر بیٹھ جاتا اور ان سے کہتا ''دادی۔ میرے لئے دعا کریں کہ مجھے ملازمت مل جائے۔ آپ کی دعاؤں کے طفیل میں یہاں تک پہنچا ہوں۔ اب مجھے آپ کی بھرپور دعاؤں کی ضرورت ہے یعنی مزید زوردار اور دھواں دھار دعاؤں کی دادی بس ایک دفعہ مجھے ملازمت مل جائے تو آپ کو سونے کی چوڑیاں بنوا کر دوں گا۔ بالکل غزالہ چچی جیسی۔ پھر جب آپ بازو ہلائیں گی تو وہ بھی ویسے ہی چھنک چھنک کر کے بج اٹھیں گی۔'' میرا دل غم سے ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

صابرہ خاتون نے بڑی محبت سے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھتے ہوئے کہا..... ''پگلے! تو کیا جانے کہ میں تو ہر وقت تیرے لئے اس کے حضور دامن پھیلائے رکھتی ہوں۔ جب جاگ رہی ہوتی ہوں تو میرے لب تیرے لئے دعا گو رہتے ہیں۔ جب سو جاتی ہوں تو میرے دل سے تیرے لئے دعائیں اور صدائیں بلند ہوتی رہتی ہیں۔ تو فکر نہ کر۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔''

اور پھر دادی کی دعائیں رنگ لے آئی تھیں۔ سعد کو ایک بینک میں کمپیوٹر کے شعبہ میں ملازمت مل گئی۔ لیاقت روزانہ صبح اسے لے کر بینک پہنچ جاتا اور اسے اس کے کمرے میں چھوڑ کر واپس آ جاتا۔ بینک کی طرف سے سعد کو ایک معاون بھی مہیا کر دیا گیا تھا۔ جونہی اس کی ملازمت کے اوقات ختم ہوتے، لیاقت اسے لینے کیلئے وہاں پہنچ جاتا۔ سعد کو ملازمت کرتے ہوئے ابھی پانچ ماہ ہوئے تھے کہ صابرہ خاتون کو بخار نے آلیا۔ مختصر سی علالت کے بعد وہ چل بسیں۔ ان کی رحلت کی خبر سن کر شوکت اور غزالہ بھی آن پہنچے۔

شمسہ زمین پر بچھی ہوئی دری پر چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ غزالہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔ ''بھابی..... ہمیں بھی ماں جی کی وفات کا سن کر بہت دکھ ہوا ہے۔ لیکن ہم نے اپنے دل کو سمجھا بجھا دیا ہے کہ موت زندگی کی بڑی حقیقت اور ہم سب کو اس کا سامنا کرنا ہے ارے آپ کیوں رو رو کر ہلکان ہوتی ہو بھلا یہ آنسو جانے والوں کو واپس لا سکتے ہیں۔ ہماری طرح اپنے آنسوؤں کو پی لو اور اپنے غم دل میں ہی رہنے دو۔''

شمسہ روتے ہوئے کہنے لگی۔ ''غزالہ۔ میں کیا کروں۔ ان آنسوؤں پر میرا اختیار نہیں۔ پتہ نہیں کیوں آج میں اتنی بے بس اور کمزور ہوگئی ہوں۔ شوکت لیاقت کے پاس جا کر اس کے گلے لگ گیا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکال کر اسے لیاقت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بھابی والدہ کی تجہیز و تکفین ان پیسوں سے کرنا۔ آخر وہ میری بھی ماں تھیں۔ میرا بھی کچھ حق ہے ان پر۔'' لیاقت نے اسے وہ پیسے لوٹاتے ہوئے کہا۔ ''میں چونکہ تم سے عمر میں بڑا ہوں اس لئے یہ خرچہ میرے ذمہ ہونا چاہیے تھا لیکن اماں کی خواہش تھی کہ یہ خرچہ سعد کی تنخواہ میں سے کیا جائے اور سعد بھی اپنی دادی کو کوئی اچھا سا تحفہ دینا چاہتا تھا اور اس کے لئے پیسے جمع کر رہا تھا۔ ان کی زندگی میں اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی..... آج پوری ہو جانے دو۔ کیونکہ اگر آج اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو پھر کبھی نہ ہو سکے گی۔''

لیاقت کی بات سن کر شوکت نے خاموشی سے وہ پیسے اپنی جیب میں رکھ لئے تھے۔ اسے تو شاید اپنے اس فرض کا خیال بھی نہ آتا۔ وہ

غزالہ کی بڑائی کا معترف تھا جس نے اسے اس کا یہ فرض یاد دلایا تھا۔اب اگر بھاجی نے غزالہ کے ان جذبات کی قدر نہیں کی تو وہ سوائے افسوس کے کیا کر سکتا تھا۔

ذیشان نے بمشکل ایف اے پاس کیا اور پھر پڑھائی ادھوری چھوڑ دی۔ وہ برے لڑکوں کی صحبت اختیار کر کے بگڑا ہوا رئیس زادہ بن چکا تھا۔اسے نئی اور بڑی گاڑیوں کا شوق تھا۔وہ اکثر اپنے ساتھیوں کے ساتھ بڑے بڑے ہوٹلوں میں کھانا کھانے کیلئے جاتا۔بہترین پوشاک پہنتا۔معظم بھی اس کے نقش قدم پر چل پڑا تھا۔غزالہ ان کے ارمان پورے کرنے کیلئے انہیں دریا دلی سے پیسے دیتی تھی لیکن جب شوکت کو بچوں کی بے راہ روی کا احساس ہوتا تو اس نے غزالہ کو سمجھایا کہ بچوں کی مصروفیات پر نظر رکھو اور انہیں حساب سے پیسے دو۔غزالہ کو شوکت کی یہ دخل اندازی ایک آنکھ نہ بھائی۔تنک کر بولی۔

''تم عجیب آدمی ہو اپنی اولاد پر شک کرتے ہو۔وہ امیر باپ کے بیٹے ہیں۔باپ کے پیسہ پر ان کا حق ہے۔اگر وہ اس پیسے سے اپنی زندگی شان و شوکت سے گزارنا چاہتے ہیں تو تمہیں کاہے کی تکلیف ہے۔''

غزالہ کی یہ بات سن کر شوکت ہمیشہ کی طرح لاجواب ہو گیا تھا اور اس نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی تھی۔

سعد ہفتہ میں ایک دو بار امام صاحب کو ملنے چلا جاتا تھا۔وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور ڈھیروں دعائیں دیتے۔سعد کے ساتھ کبھی لیاقت چلا جاتا اور کبھی شمسہ۔شمسہ جب بھی سعد کے ساتھ جاتی تو وہ اس دوران امام صاحب کی بیٹی جمیلہ کے پاس کوارٹر میں بیٹھ کر باتیں کرتی رہتی۔اگر کبھی سعد کچھ دن تک امام صاحب کے پاس نہیں جا پاتا تھا وہ ضرور خود اس کی خیریت دریافت کرنے گھر پر آ جاتے۔

اس دن سعد بینک جا چکا تھا۔لیاقت اور شمسہ گھر پر تھے کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔لیاقت نے جا کر دروازہ کھولا تو امام صاحب اپنی لاٹھی تھامے ہوئے کھڑے تھے۔لیاقت ان کو بہت احترام سے لے آیا اور کرسی پر بٹھا دیا۔شمسہ ان کے لئے چائے بنا کر لے آئی اور کہنے لگی۔

''بھائی صاحب آپ اپنے ساتھ جمیلہ کو بھی لے آیا کریں۔اس کا دل بہل جائے گا۔'' امام صاحب کہنے لگے۔

''ہمشیرہ۔دراصل آج میں جمیلہ کے بارے میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا تھا اس لئے اس کو اپنے ساتھ لانا مناسب نہیں سمجھا۔'' یہ کہہ کر امام صاحب خاموش ہو گئے۔شمسہ کہنے لگی۔

''بھائی صاحب آپ رک کیوں گئے۔ کہیے کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے۔''

امام صاحب کہنے لگے۔''میں ایک غریب آدمی ہوں۔آپ تو جانتے ہیں کہ آج کے دور میں غریب آدمی کیلئے بیٹی کو بیاہنا کیسا مشکل کام ہے۔بالفرض اس کے لئے پیسے کا انتظام ہو بھی جائے کسی انجانے شخص پر بھروسہ کرنا بھی بہت دل گردے کا کام ہے۔آج جمیلہ کی والدہ زندہ ہوتی تو شاید میری یہ مشکل قدرے آسان ہو جاتی۔''

شمسہ کہنے لگی۔''بھائی صاحب۔آپ فکر کیوں کرتے ہیں۔جمیلہ ہماری بھی بیٹی ہے۔اس کام میں آپ اکیلے نہیں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ ویسے بھی ہم آپ کے ممنون ہیں۔سعد کو اپنی شاگردی میں لے کر آپ نے جو احسان ہم پر کیا ہے ہم آپ کو اس کا بدلہ کبھی نہیں دے سکتے۔آپ حکم تو کیجئے۔''

امام صاحب کہنے لگے۔''ہمشیرہ میں حکم کرنے کیلئے نہیں، درخواست پیش کرنے کیلئے حاضر ہوا ہوں۔میری خواہش ہے کہ میں جمیلہ کا ہاتھ سعد کے ہاتھ میں دے دوں۔میں سعد کو اپنی فرزندی میں لینا چاہتا ہوں۔''

لیاقت اور شمسہ کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔پھر لیاقت کہنے لگا۔''امام صاحب اگرچہ میرے نزدیک اس رشتہ کا طے ہونا سعد کی اور ہم سب کی خوش بختی کی علامت ہے۔لیکن میرا خیال ہے کہ یہ جمیلہ کے ساتھ زیادتی ہو گی۔''

امام صاحب کہنے لگے۔''میں نے جمیلہ سے بات کر لی ہے اس

نے جب سے ہوش سنبھالا ہے وہ اپنے نابینا باپ کی آنکھوں کی روشنی بن کر اس کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔اس کے لئے بینائی کا نہ ہونا کوئی عجیب بات نہیں۔''شمسہ نے فوراً کہا کہ ہمیں یہ رشتہ دل وجان سے منظور ہے۔''

لیاقت کہنے لگا۔''امام صاحب۔ہمیں جہیز کی قطعاً ضرورت نہیں۔اس گھر میں جو کچھ ہے وہ سعد اور جمیلہ کا ہی ہے۔اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہم اگلے ماہ کی کسی تاریخ کو نکاح کیلئے آپ کے ہاں حاضر ہو جائیں۔''امام صاحب نے رضامندی ظاہر کر دی اور یوں جمیلہ دلہن بن کر سعد کی زندگی میں داخل ہوگئی۔

ایک دن شام کو شوکت اپنی کار میں دفتر سے گھر واپس جا رہا تھا کہ ذرا سے فاصلے پر ایک اندھا دھند تیز رفتار کار آتی ہوئی نظر آئی۔شوکت کی چھٹی حس نے اسے جھنجھوڑ ڈالا اور اس نے ممکنہ ٹکر سے بچنے کیلئے اپنی کار کو بائیں طرف موڑا۔ چونکہ شوکت کی رفتار بھی خاصی تیز تھی اس لئے موڑتے ہوئے اس کی کار بے قابو ہو کر سڑک کے کنارے لگے ہوئے ایک کھمبے سے ٹکرا گئی اس حادثے میں شوکت کو شدید زخم آئے۔اسے فوری طور پر ہسپتال لے جایا گیا لیکن وہ زخموں سے جانبر نہ ہو سکا۔

غزالہ کیلئے یہ خبر قیامت سے کم نہ تھی۔لیاقت بھی بہت غمزدہ تھا۔ اس نے شوکت کی دیکھ بھال چھوٹے بھائی کی طرح نہیں بلکہ بیٹے کی طرح کی تھی۔اب اگرچہ شوکت اس سے الگ ہو چکا تھا لیکن اسے اس کی طرف سے کوئی شکوہ نہ تھا بلکہ وہ مطمئن تھا کہ شوکت اپنے گھر میں خوش وخرم ہے۔اس ناگہانی حادثے نے لیاقت کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ لیاقت اور شمسہ نے غزالہ کو ہر ممکن مدد اور تعاون کی پیش کش کی لیکن غزالہ نے بے اعتنائی سے جواب دیا کہ اگرچہ شوکت کی کمی کو کوئی پورا نہیں کر سکتا لیکن پھر بھی میرے ساتھ میرے دو جوان بیٹے ہیں اب وہی میرے معاون اور مددگار ہیں۔ویسے بھی شوکت کوئی ٹٹ پونجیا نہ تھا ہمارے لئے وافر روپیہ پیسہ چھوڑ کر گیا ہے ہم سوچ سمجھ کر زندگی بسر کریں گے تو ہمیں بھلا کسی چیز کی کیوں کمی ہوگی۔پھر اس نے شمسہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''بھابی آپ میرے بارے میں کوئی فکر نہ کریں یہ میری زندگی ہے میں اسے اپنی مرضی سے بسر کروں گی۔آپ جانتی ہیں کہ مجھے اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت پہلے گوارا تھی، نہ اب ہے۔''غزالہ کی دوٹوک باتیں سن کر لیاقت اور شمسہ خاموش ہو گئے۔

شوکت کی زندگی میں ذیشان اور معظم کو باپ کی سرزنش کا ڈر تھا۔ جب ان کی زندگی سے وہ واحد رکاوٹ بھی دور ہوگئی تو دونوں بے فکری سے خوب رنگ رلیاں منانے لگے۔غزالہ کو اب پریشانی لاحق ہوگئی ان کی طرف سے پیسوں کے مطالبات روز بروز بڑھنے لگے۔غزالہ نے ذرا ہاتھ کھینچنا چاہا تو دونوں بدتمیزی پر اتر آئے۔ان کے دوستوں کی محفلیں گھر پر جمنے لگیں۔سارا دن فلمیں دیکھی جاتیں، جوئے کا دور چلتا، بازار سے رنگ برنگے کھانے منگوا کر دعوتیں اڑائی جاتیں،غرض اک ہنگامہ بپا رہتا۔ غزالہ بے بسی سے یہ طرفہ تماشہ دیکھتی اور خون کے آنسو پی کر رہ جاتی۔

شوکت کی رحلت کے ایک سال تک گھر میں خوب ریل پیل رہی۔پھر پیسہ ختم ہونے کو آ گیا۔اب دونوں بھائیوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ اس گھر کو بیچ کر ایک چھوٹا گھر لے لیا جائے تاکہ رہنے کا ٹھکانہ بھی رہے اور زندگی کا عیش وآرام بھی۔انہوں نے جب غزالہ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ بھونچکی ہو کر رہ گئی۔اس نے یہ گھر کتنے شوق سے بنایا اور کتنے ارمانوں سے سجایا تھا۔اس گھر کے چپے چپے سے اس کی کئی یادیں وابستہ تھیں۔وہ یہ گھر کسی صورت چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔اس نے اپنے بیٹوں کو بہت پیار سے سمجھایا کہ اگر اس گھر کا نچلا حصہ کرایہ پر اٹھا دیا جائے اور وہ خود اس کی اوپر کی منزل میں رہائش اختیار کر لیں تو ہر ماہ معقول آمدنی کی صورت پیدا ہو جائے گی اور گھر فروخت نہیں کرنا پڑے گا۔لیکن دونوں بیٹوں کو ماں کی یہ تجویز ایک آنکھ نہ بھائی۔کرائے کی محدود آمدنی ان کی عیش وعشرت کیلئے ناکافی تھی۔انہوں نے اپنی ماں کو واضح الفاظ میں خبردار کر دیا کہ گھر ہر صورت بک کر رہے گا اور اس معاملہ میں وہ اس کی دخل اندازی کو برداشت نہیں کریں گے۔بیٹوں کا رویہ دیکھ کر غزالہ نے اپنے آپ کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ذیشان اور معظم نے جلد ہی گھر اور گھر کے بیشتر بیش قیمت سامان کو اونے پونے بیچ کر فوری طور پر کرائے کا ایک گھر لیا اور غزالہ کو لے کر وہاں شفٹ ہو گئے۔ان کا خیال تھا کہ کرایے کے گھر میں بیٹھ کر وہ تسلی سے اپنے لئے نیا

گھر تلاش کر کے اسے خرید لیں گے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں چند پراپرٹی ڈیلروں سے رابطہ کر کے انہیں بھی تاکید کر دی تھی کئی جگہ وہ گھر دیکھنے کیلئے بھی گئے لیکن انہیں کوئی گھر پسند نہیں آ رہا تھا۔ انہیں گھر خریدنے کی بہت جلدی نہیں تھی کیونکہ وہ بے گھر اور بے زر تو نہیں تھے۔ فی الحال وہ سکون سے گھر میں رہ رہے تھے بھلے وہ کرائے کا تھا۔

سعد کی شادی کے ایک سال بعد جمیلہ کے ہاں ایک بچے نے جنم لیا شمسہ نے اس کا نام مسعود رکھا۔ مسعود کی آمد سے گھر میں بہت رونق ہو گئی۔ شمسہ کے تو پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ وہ ہوا میں اڑتی پھر رہی تھی۔ خوشی کے اس موقع پر اسے بار بار صابرہ خاتون کا خیال آتا تھا جو اگرچہ اس گھر سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہو چکی تھیں لیکن ان کی یاد شمسہ کے دل میں ابھی بھی آباد تھی۔ مسعود چھ ماہ کا ہوا کہ کارکردگی کی بنا پر سعد کو ملازمت میں ترقی مل گئی۔ اس کے ساتھ ہی اسے بینک کی طرف سے ایک کار بھی ملی۔ سعد کیلئے چونکہ کار چلانا ممکن نہ تھا اس لئے جمیلہ نے جلد ہی کار چلانا سیکھ لیا۔ اب وہ صبح سعد کو کار میں بٹھا کر بینک چھوڑ آتی اور شام کو اسے واپس بھی لے آتی۔

غزالہ اپنے دونوں بیٹوں کو بار بار گھر خریدنے کی ترغیب دیتی رہی لیکن وہ سنی ان سنی کرتے رہے۔ وہ اپنی دلچسپیوں میں اس قدر محو تھے کہ ابھی ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ ماں کی بات سن کر غور و فکر کرتے۔ ان کے لئے ہر دن عید کا دن اور ہر شب شب برأت تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی ساری زندگی اسی طرح گزر جائے گی لیکن کچھ عرصے کے بعد جب پیسہ ختم ہو گیا تو وہ قدرے پریشان ہو گئے۔ ان کے وہ دوست جن پر انہوں نے بے دریغ پیسہ لٹایا تھا، وہ اچانک اس طرح منظر سے اوجھل ہو گئے جیسے پرندے دانہ چگ کر ان دیکھی منزلوں کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ دونوں بھائیوں نے سر جوڑ کر اس مسئلے کا حل سوچنا شروع کیا۔ بہت جلد انہیں ایک بات سوجھ گئی۔

وہ دونوں غزالہ کے پاس آئے اور اسے بتایا کہ ان کے مالی حالات اب اس قدر گھمبیر ہو چکے ہیں کہ وہ گھر کا کرایہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ اگلے چند دن تک اگر کرایہ ادا نہ کیا جا سکا تو معاہدے کی رو سے مالک مکان ان کو بے گھر کر سکتا ہے۔ اپنی عزت کو بچانے کیلئے وہ اپنے زیورات ان کے حوالے کر دے غزالہ نے پہلے تو انکار کیا۔ لیکن پھر ان کے پیہم اصرار کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور اپنے زیورات کی پوٹلی الماری میں سے نکال کر ان کے حوالے کر دی۔ دونوں بھائیوں کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے انہوں نے پوٹلی اٹھائی اور اسے ٹھکانے لگانے کیلئے گھر سے باہر نکل گئے۔

ان کے جانے کے بعد غزالہ بے دم ہو کر اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔ اس کی زندگی کے گزرے ہوئے لمحے ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔ اس نے جب ہوش سنبھالا تھا تو اپنے آپ کو ایک ایسے گھر میں پایا تھا جہاں اس کی آسائش کا ہر سامان موجود تھا۔ یہ اس کے والدین کا گھر تھا۔ وہ اسی گھر میں پل کر جوان ہوئی۔ پھر وہ شوکت کے ساتھ بیاہ کر کے صابرہ خاتون کے گھر میں آن بسی تھی۔ یہ گھر اس کے والدین کے گھر سے کمتر تھا۔ اسی لئے اسے یہ پسند نہیں آیا تھا اور جونہی شوکت کے مالی حالات بہتر ہوئے تھے اس نے اپنی عقل و تدبیر سے کام لے کر اس گھر کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ پھر وہ اپنے گھر میں منتقل ہو گئی تھی۔ یہ گھر اس کے سپنوں کی تعبیر تھا، یہ اس کے خوابوں کا تاج محل تھا، وہ اس گھر میں ہمیشہ آباد رہنا چاہتی تھی لیکن وہ اس کو چھوڑنے کیلئے مجبور ہو گئی تھی اور پھر وہ اس گھر سے اپنے دامن میں صرف اپنے خوابوں کو سمیٹ کر نکل گئی تھی۔ اس کا سامان وہیں رہ گیا تھا۔ اب اس نے ایک ایسے گھر میں پناہ لی تھی جو نہ اس کا گھر تھا اور نہ ہی اس کے بچوں کا۔ اس گھر میں آنے کے بعد اس کے خوابوں کی جگہ صرف ایک خوف نے لے لی تھی کہ اگر کبھی بروقت کرایہ ادا نہ کیا جا سکا تو کیا ہو گا۔ پھر اس کے بعد وہ کہاں جائے گی۔ کس گھر کا رخ کرے گی۔ کس کے در پر دستک دے گی۔ آج جب ذیشان اور معظم اس سے زیورات لے کر چلتے بنے تھے، اس کے ذہن میں یہ سوال تیزی سے گردش کرنے لگے تھے۔ اسے حیرت اس بات پر تھی کہ اس نے اپنے تئیں اپنی زندگی کو بہت ہوشمندی اور منصوبہ بندی سے گزارنا چاہا تھا پھر نوبت یہاں تک کیسے پہنچ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کون ہے، جس نے اس کی ساری تدبیروں کو ناکام بنا دیا، کس نے

اسے بلندی سے پستی کی طرف دھکیل دیا، وہ کیسے اس انجام کو پہنچ گئی جبکہ اس نے اپنے مستقبل کیلئے عقل سے سوچ سمجھ کر منصوبے بنائے تھے، وہ بڑی ہوشمندی سے ان پر عملدرآمد بھی کر رہی تھی، اس کی رو سے کہیں کوئی خلا یا کوئی جھول نہ تھا، سب کچھ تو تھا اس کے ہاتھ میں، اس کے اہداف کے حساب سے اس کے لئے سب کچھ حاصل کرنا ممکن تھا۔ پھر کس نے اس کا پانسہ پلٹ دیا۔ وہ کون سی انجانی، ان دیکھی قوت تھی، جس نے اس کے خوابوں کو چکنا چور کر دیا، اس کی تدبیروں کو ملیا میٹ کر دیا، اس کی خواہشوں کو روند ڈالا، اس کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا اور اس کے ہر راستے کا رُخ بند گلی کی طرف پھیر دیا۔

اسے اس کارفرمائی میں کسی خفیہ ہاتھ کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ سوچتے سوچتے اچانک اسے یاد آیا کہ اس کی دادی کہا کرتی تھیں کہ:

''ہاں! وہ ایک عظیم و برتر ہستی ہے۔ وہ سب سے بڑھ کر زبردست ذات ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ ہو جا، تو ہو جاتا ہے۔ اسے وسائل کی ضرورت ہے نہ اسباب کی۔ اسی کی حکمرانی ہے بحر و بر پر۔''

آج اسے ایک ایک کر کے دادی کی کئی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل سے ایک شناسا آواز اٹھ رہی تھی۔ جو دھیرے دھیرے بلند ہو رہی تھی۔ جو اس کے آس پاس پھیل رہی تھی۔ کوئی کہہ رہا تھا:

''کوئی ہے جو میرے فیصلوں کو بدل سکے۔ کوئی ہے جو میرے حکم کو ٹال سکے۔ کوئی ہے جو مجھے مات دے سکے۔ کوئی ہے جو میرے سامنے دم مار سکے۔ میں جو چاہتا ہوں، جب چاہتا ہوں، جیسے چاہتا ہوں، کر گزرتا ہوں۔ کوئی ہے جو مجھے روکے۔''

جونہی اس نے اپنے کان اس آواز کی جانب لگائے، اس کے دل کی دنیا تہہ و بالا ہو گئی۔ اس کا سنگدل و سرکش دل، نرم و ملائم موم کی مانند قطرہ قطرہ پگھلنے لگا۔ اس کی نظروں پر پڑا ہوا پردہ اٹھ گیا اور اسے اپنی خطائیں اور کوتاہیاں نظر آنے لگیں۔ اس کی آنکھیں جل تھل ہو گئیں اور وہ بے اختیار سجدہ ریز ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر ممتاز عمر

خواب کی تعبیر

کیپٹن صاحب! صبح کی کیا تیاری ہے؟ بابا جی! اسکول میں پارٹی ہے نویں جماعت کے طلبا دسویں جماعت کے طلبا کو الوداعی پارٹی دے رہے ہیں۔ پہلے تمام طلبا ہال میں جمع ہوں گے جہاں ہماری جانب سے طالبعلم کیلئے اس کی شخصیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک ایک شعر پڑھا جائے گا پھر دسویں جماعت کے طلبا کی جانب سے محترم اساتذہ کرام کی خدمت میں اشعار کے ذریعے خراج تحسین پیش کیا جائے گا جس کے بعد کھانے پینے کا پروگرام ہے۔ باپ بیٹے کی اس گفتگو میں ماں بھی شامل ہوگئی پوچھنے لگی۔

''بیٹا وہ دن کب آئے گا جب ہمارے خوابوں کی تعبیر تم ہمارے سامنے پاک فوج کی وردی پہنے کاندھوں پر فیتے سجائے کھڑے ہوگے؟

عمر گل اپنی ماں کی یہ بات سن کر بڑی استقامت سے گویا ہوا۔''

ماما! انٹر کے بعد کمیشن کیلئے سلیکشن ہوگا اور بس آپ یہ سمجھو کہ آپ کا بیٹا بہت جلد اس منزل کو پانے والا ہے۔ صرف دو تین سال کی بات ہے۔ ہاں! مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں فوج میں کب جاؤں گا؟ آپ اور بابا جان نے تو مجھے بچپن ہی سے کیپٹن صاحب کہا کہ میری رگوں میں موجود خون کو ولولے، حوصلے اور جوش سے ہم آہنگ کر دیا ہے کہ میرا مقصد حیات فوج میں شامل ہو کر ملک وقوم کی خدمت کرنے کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔''

پشاور صدر کے گھر میں گفتگو 15 دسمبر کی شب ہو رہی تھی جہاں گھر کے مکینوں کی کل تعداد تین نفوس پر مشتمل تھی۔ عمر گل کا باپ گل فراز ایک تاجر تھا جس کی بازار میں الیکٹرانک کے سامان کی بڑی دکان تھی۔ عمر گل کی ماں عذرا خانم اپنے شوہر کی چچازاد تھی۔ شادی کے کئی سال بعد تک اولاد کی خواہش پوری نہ ہوئی اور شادی کی کئی سالگرہ ایں سونی گود کے ساتھ گزریں تو عذرا کا سرخ وسفید چہرہ پیلا پڑنے لگا مگر پھر اس کے شوہر نے تسلی دی۔ پہلے دونوں نے اپنا طبی معائنہ کرایا جس کے مطابق وہ دونوں مکمل طور پر تندرست قرار پائے ہاں! مگر قدرت کی طرف سے دیر تھی جس کے بعد دعاؤں اور منتوں کا سلسلہ شروع ہوا یوں شادی کے ساتویں سال ان کے گلشن میں عمر گل کی صورت میں پھول کھلا۔ منتوں اور مرادوں سے مانگے ہوئے اس بچے کی آمد نے گھر کی خوشیوں کو دوبالا کر دیا۔ ہر طرف خوشیاں بکھری تھیں، دعوتیں ہوئیں، مٹھائیاں بٹیں اور پھر عذرا اپنے بچے کی پرورش میں مصروف ہوگئی۔ عمر گل کے متولد ہونے کے بعد ان کے یہاں کسی اور بچے کی ولادت نہ ہوئی جس پر کچھ زیادہ خیال بھی نہ کیا گیا کہ اللہ نے جو ایک بیٹا دیا ہے وہی ان کے گھر کو جنت بنا رہا ہے۔

عمر گل کی اٹھان بڑی خوب تھی وہ اپنے ہم عمروں میں صحت مند اور ڈیل ڈول کے حوالے سے نمایاں معلوم ہوتا تھا اور کیوں نہ ہوتا ماں باپ کی تمام تر توجہ کا مرکز ومحور وہی تھا۔ تین سال کی عمر میں اسے سکول کی راہ دکھائی گئی یوں وہ آرمی پبلک سکول میں داخل ہوا۔ سکول جانے آنے کیلئے وین لگی تھی۔ ہر صبح اس کی ماں اپنے لخت جگر کو تیار کرتی اور وین میں بٹھا کر سکول کی طرف روانہ کر دیتی۔ اس دوران اس کا شوہر بھی اپنے کاروبار کی خاطر چلا جاتا۔ گھر میں ملازمہ موجود تھی مگر وہ بھی گھر کے کاموں میں جتی رہتی اور اپنے بیٹے اور شوہر کیلئے قسم قسم کے پکوان تیار کرتی۔ سردیوں کی آمد ہوتی تو عمر گل کیلئے سوئیٹر بنتی جسے دیکھ کر گل فراز اکثر کہا کرتا: بلاوجہ اتنی محنت کرتی ہو بازار میں بڑے بڑے اچھے اچھے ڈیزائن کے سوئیٹر بآسانی دستیاب ہیں۔ جس پر وہ کہتی: میرے ہاتھ کے بنے سوئیٹروں میں ماں کی جذباتی محبت اور ممتا بھی موجود ہے۔

عمر گل اپنے والدین کی امیدوں کے مطابق اپنی پڑھائی پر بڑی توجہ دے رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آٹھویں کلاس تک وہ اپنی کلاس میں اول آتا رہا۔ نویں جماعت میں بھی اس نے اے پلس کے نمبر حاصل کیے۔ وہ محض تعلیمی سرگرمیوں ہی میں مشغول نہ رہتا بلکہ ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی اپنے سکول کے ممتاز ترین طلبا میں شمار کیا جاتا۔ 15 دسمبر کی شام وہ خوبصورت کارڈوں پر اپنی خوشخطی کے جوہر دکھاتے ہوئے کافی دیر سے اشعار لکھنے میں مصروف تھا۔ اس کے باپ کی آمد اور کیپٹن صاحب کہہ کر مخاطب کرنے کے دوران ماں اور باپ کی گفتگو کے بعد یہ تینوں رات کا کھانا کھانے لگے جس سے فارغ ہو کر ایک بار پھر وہ کارڈ لے کر اشعار لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ باپ نے پوچھا: بیٹا کیا سارے کارڈ تم نے ہی لکھنے ہیں؟ جس پر وہ بولا: نہیں میرے حصے میں آدھے آئے ہیں کیونکہ میرے علاوہ حذیفہ کی لکھائی خوشخط ہے اس لیے سر نے ہم دونوں کو برابر برابر کارڈ بانٹ دیئے تھے۔ وہ رات دیر گئے تک کارڈ لکھتا رہا اور ان کے دائیں بائیں مختلف کلرز سے مزید خوبصورتی پیدا کرنے کی کوشش میں اس قدر محو رہا کہ وقت گزرنے کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ رات گیارہ بجے کے بعد اس کی ماں نے وقت بتاتے ہوئے کہا: ''بیٹا اب سو جاؤ۔

اگلی صبح عذرا اور اس کا شوہر نمازِ فجر سے فارغ ہو کر اپنی اپنی مصروفیات میں محو تھے۔ عذرا ناشتہ بنانے کے لیے کچن کی طرف چل دی جبکہ گل فراز پہلے قرآن کریم اور پھر اخبار کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ عمر گل اٹھا اور سکول جانے کی تیاری کرنے لگا۔ تمام کارڈ احتیاط سے اٹھائے، یونیفارم پہنا، جوں ہی نظر گھڑی کی طرف پڑی زور سے پکارا: ماما! میں سکول جاتا ہوں۔ ماں نے آواز دی: ناشتہ بالکل تیار ہے۔ نہیں ماما! دیر ہو رہی ہے، وین آنے والی ہے، اب ناشتے کا وقت نہیں اور آج تو اسکول میں پارٹی بھی ہے۔ اسی دوران ماں اس کے قریب آ گئی۔ بولی: بیٹا ناشتہ بالکل تیار ہے۔ اتنے میں باہر سے وین کے ہارن کی آواز آئی۔ عمر گل نے اپنی ماں کی پیشانی چومتے ہوئے کہا: ''ماما! آپ سمجھیں میں نے ناشتہ کر لیا'' اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر کی طرف چل دیا۔ عذرا محویت کے عالم میں اپنے ہونہار بیٹے کو گھر سے نکلتے دیکھتی رہی۔

عمر گل کے سکول چلے جانے کے بعد عذرا اور گل فراز نے بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ اس موقع پر گل فراز نے کہا: تم عمر گل کے ساتھ ناشتہ کر لیتیں جس پر عذرا نے بتایا: وہ رات دیر سے سویا تھا اس لیے صبح بیدار ہونے اور پھر تیاری میں تاخیر ہو گئی، ناشتہ تیار تھا میں اصرار کر رہی تھی کہ اچانک وین کا ہارن بجا اور وہ ناشتہ کیے بغیر چلا گیا۔ گل فراز بولا: وہ آج کی پارٹی میں اس قدر منہمک ہے کہ کھانے پینے تک کا خیال نہیں۔ تم نے شاید غور نہیں کیا رات کو بھی اس نے بڑے لاابالی انداز میں کھانا کھایا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر گل فراز گاڑی نکال کر اپنی دکان کی طرف روانہ ہو گیا۔

گل فراز کے چلے جانے کے بعد عذرا گھر کے کاموں کی طرف متوجہ ہوئی اسی دوران ملازمہ بھی آ گئی۔ عذرا نے کہا: میرا خیال ہے کہ آج مشین لگا کر کپڑے دھو لیے جائیں، تم دونوں کمروں کی جھاڑو دے کر مشین لگا لو۔ یہ کہتے ہوئے وہ خود کچن کی طرف چل دی۔ کچن اور ٹی وی لاؤنج ساتھ ساتھ تھے ہمیشہ کی طرح ٹی وی چینلز پر پروگرام جاری تھے جن میں سے ایک چینل پر مصالحے والی تہہ دار بریانی بنانے کی ترکیب بتائی جا رہی تھی۔ عذرا کچن کی مصروفیات ترک کر کے بریانی بنانے کی اس ترکیب کو سمجھنے کیلئے ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھی۔ دن گیارہ بجے کا وقت تھا ایک طرف ترکیب بتائی جا رہی تھی تو ساتھ ہی نیچے بریکنگ نیوز کی پٹی چلنی شروع ہوئی۔ تازہ ترین خبر یہ تھی کہ آرمی پبلک سکول پر دہشتگردوں نے حملہ کر دیا ہے۔ سکول اور کالج کے بچے اور اساتذہ یرغمال بنا لیے گئے ہیں۔ یہ خبر وقفے وقفے سے آ رہی تھی کہ اچانک نشریات روک کر آرمی پبلک سکول کے بارے میں فوری معلومات پیش کی جانے لگیں۔ عذرا نے گھبرا کر کئی چینل بدل ڈالے ہر چینل سے یہی خبر نشر ہو رہی تھی جس میں ابتدائی طور پر چند بچوں کے وحشیانہ قتل کی خبر آ رہی تھی۔

عذرا کی نظریں اور کان بظاہر ٹی وی اسکرین کی طرف تھے مگر لاشعوری طور پر وہ سکول میں موجود دہشتگردوں کی فائرنگ کا تصور کرتے ہوئے اضطراب و بے چینی سے دوچار ہو کر موبائل فون اٹھایا۔ اپنے شوہر کا نمبر ڈائل کیا مگر ابتدائی کئی کوششوں میں رابطہ نہ ہو پایا۔ نیٹ ورک

بڑی معلوم ہوتا تھا دوسری طرف سے گل فراز کی کٹی کٹی آواز سنائی دی جس میں وہ کہہ رہا تھا، میں گھر آ رہا ہوں۔ کچھ ہی دیر میں وہ آ پہنچا۔ اس دوران ٹی وی چینلز آرمی پبلک سکول میں رونما ہونے والے دہشتگردی کے واقعے کو براہِ راست نشر کر رہے تھے۔ دہشتگردی کا نشانہ بننے والے بچوں کی تعداد بڑھتے ہوئے پچاس سے زائد ہو چکی تھی اور یہ خبر ان کے اضطراب کو مزید بڑھانے کا باعث تھی کہ دہشتگردوں نے سکول کے اس ہال کو بھی نشانہ بنایا ہے جہاں نویں دسویں کے طلباء کی پارٹی ہو رہی تھی۔ گل فراز نے گھر پہنچتے ہی بتایا کہ ہر طرف افراتفری کا عالم ہے، بازار بند ہو چکے ہیں، میں نے کئی بار سکول سے رابطے کی کوشش کی مگر ایک تو نیٹ ورک بزی ہیں اور پھر شاید حالات کی سنگینی کی وجہ سے رابطہ ممکن نہیں ہو پا رہا، میں اس وقت سکول جا رہا ہوں۔ وہاں جا کر کچھ معلومات حاصل ہو پائیں تو تمہیں بھی بتاتا ہوں۔ ابھی اس کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ عذرا بڑی لجاجت سے بولی: مجھے بھی ساتھ لے چلیے میرے لیے یہاں بیٹھنا اور انتظار کرنا ناقابلِ برداشت ہوگا۔ خدارا! آپ مجھے ساتھ لے چلیں۔ گل فراز نے کہا: اس موقع پر تمہارا جانا مناسب نہیں مگر عذرا کے مسلسل اصرار اور روتی صورت دیکھ کر گل فراز نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ساتھ لے جانے پر آمادہ ہو گیا۔

ان کے گھر سے آرمی سکول کی مسافت پندرہ منٹ کی ہو گی مگر ہر چوک پر ٹریفک جام تھا، ہر ایک جلدی جانے کی کوشش میں ٹریفک قوانین سے بالاتر راہوں کا متلاشی تھا یوں گاڑیوں کی رفتار کم اور ہارنوں کی زیادہ تھی۔ قریباً پون گھنٹے کی تگ و دو کے بعد وہ سکول سے کچھ فاصلے پر روک لیے گئے۔ یہاں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ سکول کی طرف جانے والے وہ اکیلے نہیں سینکڑوں والدین اور تھے جو بہت جلد سکول پہنچ جانا چاہتے تھے مگر پولیس اور انتظامیہ نے تمام راہیں مسدود کر کے لوگوں کو آگے بڑھنے سے روک رکھا تھا۔ ہر طرف سے ایمبولینسوں کا شور تھا، کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ گل فراز اور عذرا گاڑی سے اتر کر ایک جانب آ کھڑے ہوئے جہاں ان جیسے بہت سے والدین آنکھوں میں خوف سجائے کھڑے تھے۔ سب کی زبانیں تقریباً گنگ تھیں۔ یہاں صرف جو آواز سب سے نمایاں تھی وہ ایمبولینس کے سائرن تھے جو شاید اپنی قوت سے نہیں تعداد کی وجہ سے چیختے چلاتے محسوس ہوتے تھے۔ پھر کہیں سے صدا سنائی دی کہ فوجی آپریشن کا آغاز ہو چکا ہے، سینکڑوں بچے بحفاظت نکال لیے گئے، زخمی اور مرنے والوں کو لیڈی ریڈنگ ہسپتال کی طرف روانہ کیا جا رہا ہے۔

جن بچوں کو زندہ و بحفاظت نکالا گیا تھا انہیں ٹولیوں کی شکل میں لایا جا رہا تھا۔ خوف کی ان فضاؤں میں جن والدین کو اپنے بچوں کے دمکتے چہرے نظر آئے وہ خوشی کے آنسو بہاتے ان سے چمٹ کر ان کے بوسے لے رہے تھے، کچھ دیر تک بچوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا اور پھر مایوسی کے بادل چھانے لگے، لوگ لیڈی ریڈنگ ہسپتال کی طرف کھسکنے لگے۔ گل فراز بھی اپنی گاڑی میں بیٹھا عذرا اس کے برابر والی نشست پر خاموش آنسوؤں کی لڑی بہاتی خوف اور حسرت کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ہسپتال سے کچھ فاصلے پر انہوں نے اپنی گاڑی کھڑی کی اور پیدل ہسپتال کی طرف چل دیئے۔

ابھی وہ چند قدم آگے بڑھے تھے کہ سامنے سے آنے والی ایک خاتون عذرا سے چمٹ کر بلک بلک کر رونے لگی۔ یہ حذیفہ کی ماں تھی جس کا غم دیکھا نہ جاتا تھا۔ وہ کہنے لگی: بہن دعا کرو میرا بچہ بچ جائے وہ اسے آپریشن تھیٹر میں لے گئے ہیں کہتے ہیں آپریشن ہوگا۔ اس کے ہمراہ دوسری عورتیں اسے تسلی دینے لگیں۔ عذرا نے کہا: عمر گل کا بھی کچھ پتہ نہیں ہے؟ جس پر وہ بولی: میں سارے زخمی بچے دیکھ آئی ان میں تو وہ نہیں ہے۔ میرا خیال ہے اسے کسی قسم کا زخم نہیں آیا۔ اس کا جملہ مکمل نہ ہوا تھا کہ عذرا بولی: مگر جو بچے بحفاظت نکالے گئے ان سب میں تو میرا عمر گل نہیں تھا۔ جس پر حذیفہ کی ماں بولی: کچھ زخمی بچے دوسرے ہسپتالوں میں بھی لے جائے گئے ہیں وہاں دیکھ لو۔ گل فراز نے کہا کہ پہلے ہم یہیں دیکھیں گے پھر کسی دوسرے ہسپتال کا رُخ کریں گے۔

ہسپتال کے داخلی دروازے پر بڑا رش تھا وہ بڑی مشکل سے ایمرجنسی وارڈ میں پہنچے، وہاں موجود زخمی بچوں کو ایک ایک کر کے دیکھتے رہے اچانک ان کی نظر نورالعارفین پر پڑی۔ عذرا نے کہا، بیٹا کیسے ہو؟

وہ بڑی نحیف آواز میں بولا: آنٹی ٹھیک ہوں، عمر گل وہ تو شاید..... یہ کہتے کہتے اس کے ہونٹ بھنچ گئے، اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں، چہرے پر کرب واذیت کے احساس کی شدت سے آنکھوں سے آنسو جاری تھے جسے دیکھتے ہی وہ دونوں بے قرار ہوکر تمام مریضوں کو دیکھنے کے بعد انتہائی بے چینی کے عالم میں مردہ خانے کی طرف گئے کہرام مچ رہا تھا، ہر طرف آہوں اور چیخوں کی صدائیں تھیں۔ ماں باپ اپنے بچوں کی لاشوں کے گرد کھڑے زاروقطار رو رہے تھے۔ صبر صبر کی آوازیں بلند ہوئیں مگر نالہ وفریاد کی صدائیں آسمان کو چھو رہی تھیں۔ جن لاشوں کی شناخت نہ ہوئی تھی وہ دونوں ان کی طرف بڑھے۔ چند لاشوں کے بعد ہی ایک چہرے پر ان کی نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ یہ نوجوان جس کی آنکھیں اور ہونٹ کھلے تھے کوئی اور نہیں ان کا لخت جگر عمر گل تھا۔ ان دونوں پر سکتہ طاری تھا، رونا چاہتے تھے مگر آواز نہ نکلتی تھی پھر قریب کھڑے ایک شخص نے جو غم سے بوجھل مگر تسلی پا چکا تھا ان تینوں کے چہروں کو پہچان کر گل فراز کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی اور صبر کی تلقین کرنے لگا۔ اس کی تسلی نے تمام بندھن توڑ ڈالے گل فراز بے اختیار اس شخص سے چمٹ کر زاروقطار رونے لگا اسے احساس بھی نہ ہوا کب عذرا بے ہوش ہوکر عمر گل پر جا گری۔ لوگوں کی آواز نے اسے چونکا دیا، اس دوران ہسپتال کا عملہ قریب آچکا تھا۔ انہوں نے عذرا کو ہوش میں لانے کی کوشش کی، وہ ہوش میں آئی مگر چند ہی لمحے بعد دوبارہ بے ہوش ہوگئی اسے اسٹریچر پر لٹا کر مردہ خانے سے باہر لے جایا گیا۔ کچھ دیر بعد گل فراز ایمبولینس کی اگلی نشست پر بیٹھا تھا۔ پیچھے اسٹریچر پر اس کا بیٹا جسے وہ ''کیپٹن عمر گل'' کہا کرتا تھا ابدی نیند سو رہا تھا۔ اس کی ماں بیٹھی ہوئی کہہ رہی تھی: میرے بیٹے! تم نے تو کہا تھا ماما آپ سمجھیں میں نے ناشتہ کرلیا۔ یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر اس کی آہیں سسکیوں میں بدل گئیں۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر فضل عظیم

بڑھاپے کی آمد اور میری تیاری

اب میں سرکاری عمر Official Age کے لحاظ سے 60 سال کا ہو رہا ہوں اور اس طرح میری انٹری بوڑھوں کے رجسٹر میں ہو جائے گی۔ اس بڑھاپے نے واپس جانا نہیں۔ بقول شاعر۔

جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی
جو آ کے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا

یہ بڑھاپا مجھے بری طرح جھنجوڑتا ہے کہ دنیا سے فراق کا وقت قریب آ لگا ہے۔ احباب سے فراق کی گھڑی بس سر پر کھڑی ہے۔ بس اب رحمت الٰہی میرے سامنے کھل رہی ہے۔ اور میں فراق کا یہ دردناک منظر مسرت اور تسلی میں تبدیل ہوتے دیکھ رہا ہوں۔ میں درج ذیل حقائق کو سامنے رکھ کر اپنے دل میں مسرت محسوس کر رہا ہوں۔

1) میرے اللہ نے قرآن میں سو (۱۰۰) سے زائد مقامات پر اپنا تعارف الرحمان الرّحیم سے کیا۔ اس لئے میرے لئے سب سے بڑی امید اور سب سے روشن سہارا اس کی رحمت ہے۔

۲) جب میرے پاؤں بڑھاپے کی دہلیز پر پڑے اور میرا جسم جو میری روح کا ٹھکانہ ہے کمزور ہونے لگا تو میں اپنی عمر کے اس حصے کو یاد کرنے لگا جو میں نے شباب کی غفلت میں ضائع کیا۔

اس میں گناہوں اور خطاؤں کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن جب میں نے کائنات کی کامل ترین کتاب قرآن مجید کو ٹٹولا تو مجھے سہارا ملا کہ اس میں ہر بیماری کی دوا ہر اندھیرے کی روشنی اور ہر مایوسی کیلئے امید ہے۔ اسے سننے اور اس کی تلاوت سے لطف اندوز ہونے نے میری دستگیری کی اور آخرت پر ایمان کے نور نے مجھے زبردست روشنی عطا کی۔

۳) جب آخرت موجود ہے دائمی ہے اور دنیا سے زیادہ خوبصورت ہے اور مجھے پیدا کرنے والی ذات رحیم و کریم ہے اور ایمان اور عمل سے بھرپور بڑھاپا درحقیقت عالم رحمت کی طرف منتقل ہونے کی علامت ہے، تو میں اس پر اچھی طرح راضی کیوں نہ ہوں!

۴) میں ایک انسان ہوں اس لحاظ سے کائنات کی کامل ترین مخلوق ہوں۔ میری فطرت میں بقا کا شوق پنہاں ہے۔ اس لئے میں بدیہی طور پر عالم فانی کے بعد عالم باقی کی خواہش رکھتا ہوں۔ اسے ایمان بالآخرت بھی کہتے ہیں اور یہ عقیدہ میرے لئے زبردست نور اور عظیم تسلی ہے ایک نہیں سو بڑھاپے بھی جمع ہو جائیں تو یہ تسلی ان کے لئے کافی ہے۔ اس لئے میں خوشیاں مناتا ہوں اور اپنے اللہ سے ایمان کے کمال کی دعا کرتا ہوں۔

۵) اللہ کے دربار میں سب سے بڑے سفارشی بندے کا عجز اور کمزوری ہے اور سب جانتے ہیں کہ بڑھاپے کا زمانہ عجز اور کمزوری ہے اور سب جانتے ہیں کہ بڑھاپے کا زمانہ عجز اور کمزوری کی انتہا ہے تو پھر میں اس سے منہ کیوں موڑوں کیونکہ یہ تو اللہ کی دربار میں میرا شفیع ہے۔

۶) جب میرے بالوں میں چاندی اترائی، مجھے اللہ کی طرف سے نذیر ملا (وقد جاءتکم النذیر) تو مجھے اللہ کے برگزیدہ پیغمبر زکریاؑ کی پکار یاد آ گئی۔ جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا۔

ترجمہ: ''میری ہڈیاں تک گھل گئی ہیں اور سر بڑھاپے سے بھڑک اٹھا ہے۔ اے میرے پروردگار میں کبھی تجھ سے دعا مانگ کر نامراد نہیں رہا۔''

جس طرح زکریاؑ کو بڑھاپا آیا اس طرح مجھے بھی آیا۔ لیکن میں نے ڈرنے کے بجائے قرآن سننا شروع کیا تو مجھے اس آیت نے حوصلہ دیا۔

ترجمہ: ''ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو خوشخبری دو کہ ان کے لئے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔''

چنانچہ اس کے پڑھنے کے بعد مجھے موت کا چہرہ تاریک کی بجائے خوبصورت اور روشن لگا۔ کیونکہ میں سمجھا کہ موت ابدی زندگی کی تمہید ہے۔ یہ تو ان احباب کے قافلے سے ملاقات کا سبب ہے جو عالم برزخ کی طرف کوچ کر چکے ہیں۔

۷) میں نے شباب پر غور کیا تو مجھے یہ شباب غفلت اور گناہوں میں بیتا ہوا نظر آیا۔ میں سمجھا کہ جوانی پر بڑی خوبصورت خلعت کے نیچے ایک بدصورت اور عبرتناک چہرہ چھپا ہوا ہے۔ اب میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے مجھے شباب کی تباہیوں اور نقصانات سے نجات دلا دی اور مجھے بڑھاپا دیا جو اللہ کی رحمت اور اس کے کرم کو متوجہ کرنے کا ذریعہ ہے۔

گناہوں سے بچنے والے ایماندار بوڑھوں کا رزق رحمت الٰہی کی جانب سے برکت بھی لے کر آتا ہے۔ ہر گھر کی برکت کا دارومدار اس گھر کے بوڑھے ہوتے ہیں اور ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ اگر خمیدہ پشت بوڑھے نہ ہوتے تو تمہارے اوپر مصیبتوں کے انبار لگ جاتے۔ اللہ تعالیٰ تو بوڑھوں کی سفارش خود کرتا ہے۔

اما یبلغن عندک الکبر احدھما او کلاھما فلا تقلّ لّھما اف ولا تنھر ھما وقل لھما قولا کریما

اس کو دیکھ کر میں اپنے بڑھاپے کو سو بچپن سے نہ بدلوں۔ کیونکہ بڑھاپے میں بہت سی لذتیں ہیں۔

۸) اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے مجھے دنیا کی بے حقیقت لذتوں کے بجائے ایمان اور توحید کے نور پانے کی توفیق بخشی۔ ایمان کے اس نور کے ساتھ میں بڑھاپے کو ہلکا سمجھتا ہوں۔ اس کی گرمی اور روشنی سے لطف اٹھاتا ہوں اور غافلوں کی طرح اس میں بوجھ محسوس نہیں کرتا۔ کیونکہ انتہائی بوجھل اور بڑا تاریک اور دردناک بڑھاپا گمراہوں کا بڑھاپا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں گمراہی سے بچالیں۔

۹) بڑھاپے میں سب سے زیادہ دردناک منظر احباب کا بچھڑنا ہے۔ یہ احباب کا بچھڑنا میرے لئے اس لئے مسئلہ نہیں ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم میں ہے۔ **لہ ملک السموات والارض یحی و یمیت وھو علی کل شئ قدیر.**

جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا نے برباد ہونا نہیں، بلکہ خالق حقیقی نے عارضی تصویروں کو دائمی تصویروں میں تبدیل کرنا ہے۔

ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی!

۱۰) میرے لئے بڑھاپے میں سب سے زیادہ Inspiring یہ حدیث ہے کہ اللہ کی رحمت کو اس بات سے حیا آتی ہے کہ کسی بوڑھے مومن مرد اور عورت کا دعا کیلئے اٹھا ہاتھ خالی لوٹا دیں اب میں اس رعایت سے بھرپور فائدہ اٹھاؤں گا۔ مجھے یہ بھی خوشی ہے کہ میں اس عالم کی طرف رواں دواں ہوں کہ جہاں نبی کریم ﷺ تشریف لے گئے ہیں۔ وہاں وہ سراجٌ منیر کی طرح ہونگے۔ اور ان کے اردگرد اولیاء اور صوفیاء کے ستارے ہالہ بنائے ہوئے ہوں گے۔ اور نبی ﷺ کی سنت کی پیروی ہی انسانوں کو کامیاب کراتی ہے۔ انشاءاللہ

☆.....☆.....☆

افشاں نوید

کشف

سب دن ایک جیسے اور سب راتیں بھی.....مگر انہی دنوں میں سے کوئی دن،لمحوں میں سے کوئی لمحہ ٹھہر سا جاتا ہے اور کبھی لمحات صدیوں پر بھاری ہو جاتے ہیں۔بس چلتے پھرتے چھوٹے موٹے واقعات کبھی بڑے حقائق کو کشف کرنے کا سبب بن جاتے ہیں اور کبھی دقتیں مطالعہ اور عالمانہ صحبتیں بھی ان حقائق کو کھولنے سے عاجز رہتی ہیں!

ثریا بیگم کا اضطراب بے وجہ تو نہ تھا۔رات کانٹوں پر لوٹ کر گزاری انہوں نے۔بڑی بیٹی ماریہ کے ہاں بچے کی ولادت کے دن قریب آ لگے تھے۔بہو اور بیٹیوں کے لئے ان مواقع پر وہ ہمیشہ بڑھ چڑھ کر اپنی خدمات پیش کرتیں۔بیٹیوں کو بھی اپنے ہاں لے آتیں کہ زچہ و بچہ کی اچھی طرح خدمت کر سکیں اور بہوؤں کی بھی خوب خدمت کرتیں کہ یہ سعادت کے لمحے اور خوشی کی گھڑیاں ہیں۔اپنے خاندان میں اضافے پر پھولے نہ سماتیں اور شکر کے طریقے ڈھونڈا کرتیں۔

ماریہ کے ہاں پہلی ولادت بھی آپریشن سے ہوئی تھی۔ڈھائی سالہ فہد کی ننھی جان کو سنبھالنے کیلئے اب ثریا بیگم کی خواہش تھی کہ فارینہ اپنی خدمات پیش کرے جوان کی لاڈلی چھوٹی بیٹی تھی اور تعلیم کے اختتامی مراحل میں تھی۔اگر جمال صاحب کو ہارٹ اٹیک نہ ہوتا تو ثریا بیگم کو اپنی خدمات پیش کرنے میں کوئی عذر حائل نہ تھا۔لیکن شوہر کو وہ کس پر چھوڑ کر جاتیں!ڈاکٹر نے انتہائی احتیاط اور مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا اس لئے وہ تو شوہر کے بستر کے ساتھ ہی لگ گئی تھیں۔ان کے کھانے پینے،سونے جاگنے،وقت پر دوائیں دینے،کسی ذہنی پریشانی سے بچانے اور کل وقت ان کو کمپنی دینے کا کام ان کے سوا کون کر سکتا تھا اور انہوں نے ان سب کاموں کو ہمیشہ عبادت سمجھ کر ہی کیا تھا۔

اب عجیب مخمصے میں مبتلا ہو گئی تھیں وہ!ایک طرف شوہر کی صحت کی فکر تو دوسری طرف ماریہ کے ہاں ولادت کی قریب آتی تاریخیں۔سارے خاندان میں ان کی نظر انتخاب جا کر فارینہ ہی پر ٹوٹی کہ وہ اس نازک وقت میں بہن کے کام آ جائے۔کیونکہ ماریہ کی سسرال میں فقط ساس ہی ہیں جو خود جوڑوں کی ہمہ وقتی تکلیف میں مبتلا رہتی ہیں۔ماریہ خود بہت باحوصلہ اور مضبوط شخصیت کی مالک تھی۔وہ زیادہ کسی کو تکلیف دینا پسند بھی نہ کرتی تھی۔مگر بات تو ڈھائی سالہ فہد کی تھی جو دادی سے بے انتہا قریب تھا۔لیکن تمام وقت اس کے پیچھے پیچھے پھرنا،اس کے سارے کام،اس کی نئی نئی شرارتوں کو ہینڈل کرنا،اس کو ہر وقت نقصان سے بچانا ایک مستقل اور سخت جاب تھی۔اب تو فہد میاں گیٹ کھلا دیکھ کر دروازے سے باہر نکل جاتے،کبھی پائپ میں لگا نل کھول کر پودوں کو پانی دینے لگتے،کبھی اسٹول پر چڑھ کر کچن کی دراز کھول کر برتن نکال لاتے،کبھی چولھا جلاتے،کبھی غسل کرنے کی کوشش کرتے پائے جاتے،خوب سوچنے والا دماغ اور متحرک وجود،جس کو کنٹرول کرنے کیلئے اس سے زیادہ متحرک فرد کی ضرورت ہوتی ہے۔ماں کے بن کس قدر بوجھل ہے اولاد کو سنبھالنا۔وہی ایک ماہر نفسیات کی طرح ایک چھوڑ چھ بچوں کو بیک وقت ہینڈل کر لیتی ہے اس لئے کہ ماں بہر حال ماں ہے۔کائنات کی انہونی تخلیق!

فارینہ کے سمسٹر کے امتحان کی تاریخ اگرچہ قریب تھی مگر وہ یہ سمسٹر یا کچھ پیپرز بعد میں بھی دے سکتی تھی۔ثریا بیگم کی اس سے متعدد بار اس موضوع پر بات ہوئی تھی مگر وہ کسی طرح اسکو قائل ہی نہ کر سکیں۔اس کا خیال تھا کہ اس کا بہت سارا وقت ضائع ہو جائے گا اور وقت کا نعم البدل کہیں دستیاب نہیں۔وہ دوستوں کے ساتھ امتحان دے گی تو تیاری بھی اکٹھے ہو جائے گی بعد میں وہ کس طرح امتحان دے گی؟اور کیا اتنی

چھوٹی سی بات کیلئے وہ اتنی بڑی قربانی دے؟ فارینہ کا خیال تھا کہ امی اس موضوع پر بار بار بات کر کے اس کے ساتھ زیادتی کر رہی ہیں۔ اگر ماریہ ان کی بیٹی ہے تو فارینہ بھی وہی تمام حقوق رکھتی ہے۔ امی کو ماریہ کی فکر اتنی غالب نہیں ہونا چاہیے کہ وہ مجھے قربانی کا بکرا بناتی پھریں۔ اس کام کیلئے کسی آیا کو بھی رکھا جا سکتا ہے۔ یا اگر امی کا جانا ضروری ہے تو ابو کی خدمت گیری کے لئے کچھ دن کسی ملازم لڑکے کی خدمات حاصل کر لی جائیں۔ فارینہ بھی ماں کو بار بار مختلف آپشنز پر سوچنے کی دعوت دیتی مگر ان کا خیال یہی تھا کہ ماریہ اور اس کی سسرال پر بہت برے اثرات ہونگے اس بات کے کہ اس کو میکے سے تنہا چھوڑ دیا گیا۔

فارینہ جو ''ٹائم مینجمنٹ' کی اسکول کے زمانے سے اب تک لاتعداد ورکشاپس اور لیکچر اٹینڈ کر چکی تھی اور اب تو خود اس موضوع پر اچھا خاصا بول لیتی تھی اور کنوینس کر لیتی تھی لوگوں کو اس کی عقل میں بات نہیں سما رہی تھی کہ وہ ایک دو دن نہیں تین یا چار ہفتے ایک ایسے کام میں ضائع کر دے جو اس کے علاوہ دوسرے بھی کر سکتے ہیں۔ فارینہ جیسی ذہین طالبہ جس نے اپنے کیریئر کے لئے تمام سماجی تقاریب سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی، دوستوں کا حلقہ بھی انتہائی محدود رکھتی تھی۔ فیس بک اور ٹوئٹر ٹائپ چیزیں بھی اس کے لئے کوئی کشش نہ رکھتی تھیں کہ اس کے خیال میں یہ تضیع اوقات کا سبب تھیں۔ وہ کتابوں کی دنیا میں گم رہنے والی لڑکی پورے زمانہ طالب علمی میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوتی رہی تھی۔ ثریا بیگم نے گھر کی ذمہ داریاں یوں بھی اس پر نہ ڈالیں کہ ایک تو وہ چھوٹی تھیں۔ دوسرے پڑھائی کی دھنی اور تیسرے اللہ نے نوکر چاکروں کی سہولت دے رکھی تھی۔ اس لئے بوقت ضرورت بس چھوٹے موٹے کاموں میں ہاتھ بٹا لیتی تھی۔

مگر وہ اپنے موقف میں اتنی سخت گیر ہو گی یہ ثریا بیگم کے تصور سے ماورا تھا۔ ایک ایسے وقت میں جب خاندان کو اس کی ضرورت ہے وہ اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دے رہی ہے۔ کل بیاہ کر دوسرے گھر جانا ہے اور زندگی تو قربانیوں سے عبارت ہے۔

ان کی اپنی فکریں ہی کیا کم تھیں کہ آج کام والی بھی نہیں آئی جبکہ دوسری کام والی پہلے ہی بیٹی کے ہاں ولادت کے باعث چھٹی پر گئی ہوئی تھی آج کے سارے معمولات تلپٹ ہو گئے۔ دوسری صبح ماسی رشیدہ کو دیکھتے ہی وہ غصے سے پھٹ پڑیں کہ اگر تم بیمار تھیں تو اپنی بیٹی کو بھیج دیتیں۔ اس کی فارینہ کی عمر کی بیٹی جو کبھی کبھار اس کی غیر موجودگی میں اس کے حصے کا کام کرنے آ جاتی۔ وہ بولی:

''بیگم صاحبہ میری بیٹی نہیں آ سکتی اس کو اپنی بہن کے بچے سنبھالنا ہوتے ہیں۔ وہ میرے ساتھ گھر سے نکلتی ہے میں اسے بہن کے ہاں چھوڑ کر آپ کے پاس آتی ہوں کیونکہ اس کی بہن کے شوہر کا روزگار بہت مندا ہے۔ گھروں میں سفیدی کرتا ہے کبھی مزدوری ملتی ہے کبھی نہیں۔ وہ اس کے بچوں کو سنبھالتی ہے تو وہ سلائی کر لیتی ہے۔ کبھی سلائی زیادہ آ جائے تو گھر کے کام کاج بھی میری دوسری بیٹی ہی کرتی ہے اس کے گھر کے۔''

ثریا بیگم کے چہرے پر یکے بعد دیگرے کئی رنگ آئے۔ وہ جو کرسی کی پشت تھامے کھڑی تھیں تھک کر کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئیں۔ ماسی کو قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولیں۔

''تمہاری بیٹی خود جاتی ہے بہن کے پاس یا تم بھیجتی ہو زبردستی؟''

''نہیں بیگم صاحبہ توبہ کرو جو میں بچوں پر زبردستی کروں اپنے۔ وہ بہن ہے آخر۔ اور مشکل کی گھڑی میں بہن ہی بہن کے کام نہ آئے تو فائدہ ایسے رشتوں کا..... وہ بڑا پیار کرتی ہے اپنی بھانجی اور بھانجوں سے۔ وہ بھی ماں کی طرح اس سے لپٹے رہتے ہیں۔ میں کہتی ہوں تیرے چاچے کا بیٹا اب دبئی جانے والا ہے۔ کیا پتہ چاچا تیرا رشتہ بھیج دے اس نیکی کے صلے میں۔ آخر اللہ بھی تو بندے کو دیکھتا ہے ناں..... کیا پتہ رب راضی ہو جائے، تو وہ جھٹ بولی ماں توبہ کر۔ کبھی نیکی زیادہ حاصل کرنے کیلئے نہ کر..... میں کوئی احسان نہیں کر رہی، ساری دنیا میں اپنے ہی کام آتے ہیں اپنوں کے..... بھائی رشیدے کو اللہ کرے مستقل روزگار مل جائے تو فریدہ آپا کو میری ضرورت ہی کیوں رہے گی۔ وہ تو بے چاری خود مجبور ہے کہ بچوں کو بھوکا کیسے دیکھے۔''

ماسی بولتی چلی گئی اور ثریا بیگم کے سامنے سے حجاب ہٹتے چلے گئے۔

''ہاں بیگم صاحبہ یہ دنیا ہے۔ سب دکھ درد کے گھر میں ہیں..... بس جن کے اپنے نصیب ہیں وہ اپنوں کا دکھ بانٹ لیتے ہیں۔ وقت تو گزر ہی جانا ہے۔''

ماسی یہ کہتے ہوئے دوپٹہ سر کے گرد لپیٹ کر تیز تیز قدموں سے کچن کی سمت چلی گئی اور ثریا بیگم جاتے ہوئے اس کی پشت کی جانب دیکھتی رہی گئیں کہ یہ بظاہر جاہل، مسکین غریب عورت زندگی کی حقیقت کو یقین کی حد تک جانتی ہے۔ ہم جو اپنے وقت کے لئے بہت خودغرض ہیں کیونکہ وقت کی حقیقت کو جانتے ہیں۔ ہم نے ماہ وسال دن، گھنٹے، منٹ سب کچھ اپنے لئے پلان کر رکھے ہیں۔ اس لئے کہ ہم وقت کو اپنا سمجھتے ہیں کتنا مبارک ہے ان کا وقت جو ''دوسروں'' کیلئے ہے۔ کتنے عظیم ہیں یہ خاندان جن کے دکھ سانجھے ہیں.....اور کتنے تنہا ہیں ہم! کوئی ہمارے برے وقتوں کا بھی ساتھی نہیں کیونکہ ہم نے اچھے وقتوں میں اپنے وقت پر کسی کا حق ہی تسلیم نہ کیا تھا۔ ہم جو وقت ضائع کرنے کے بارے میں اتنے باشعور ہیں کہ فون بھی اسکرین پر نام پڑھ کر ہی ریسیو کرتے ہیں۔ بے نام لوگوں یا غیر مطلوبہ لوگوں کو ہم اپنا وقت کیوں دیں؟ مگر ان کے پاس تو وقت کا دریا ہے جو ہر اک کے لئے بہتا ہے۔ میری بچی فارینہ کن دائروں میں قید ہے؟ کتنی محبوس ہے وہ اپنی شخصیت میں؟ وہ اپنے وقت پر کسی کا حق تسلیم کرنے پر آمادہ ہی نہیں۔

آہ! تعلیم وتربیت.....کیسی تعلیم دلائی میں نے اور کیسی تربیت کر سکی میں اس کی.....کہ میں اس کو رحم کے رشتوں کی حقیقت تک نہ سمجھا سکی۔ مجھ سے اچھی تعلیم اور تربیت تو اس ماسی نے کی ہے اپنی بیٹی کی۔ اس کو ذات کا قیدی تو نہیں بنایا۔ مگر سماج میں ہمارے تشخص میں کتنا فرق ہے۔ یہ جاھل اور درماندہ لوگ جو اپنی کوئی اعلیٰ سماجی شناخت نہیں رکھتے مگر ان کی بعض اقدار کتنی اعلیٰ ہیں۔ مگر ہم اپنی سوچوں کے اسیر ہیں جو علیل ذہنوں میں پرورش پا رہی ہیں۔ کتنے حجاب ہمارے اور حقیقتوں کے درمیان حائل ہیں۔ وہ موٹی موٹی کتابیں اور اعلیٰ ڈگریاں بس اتنا ہی انسانیت کا درس دے سکیں۔ اعلیٰ تعلیم پر توجہ دے کر تربیت کا حق تو شاید میں نے بھی ادا نہ کیا۔ ہم سب اپنی کاشت کی ہوئی فصلیں ہی تو کاٹتے ہیں

میں نے اس کو ''ٹائم'' کے درست مصرف کا تصور دیئے بغیر ٹائم مینجمنٹ کے کورس کروائے۔ اصلی نفع اور نقصان بتائے بغیر خسارے کی بیلنس شیٹ بنانا سکھائی۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ وقت کا کونسا استعمال دنیا کے حساب کتاب سے ماورا ہو کر اعمال کے پلڑے کو بھاری کر دیتا ہے!

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ کورس اس کو اپنے لئے ہی جینا سکھائیں گے اور اس کو اپنی ذات کا قیدی بنا دیں گے، اس سے سماج کا درد چھین لیں گے تو میں اس کو بازر کھتی اس تعلیم اور تربیت سے!

ثریا بیگم کا شکستہ دل ایک ہی انداز سے سوچنے پر مجبور تھا کہ انسانیت کا درس تو کتابوں سے ماورا ہے اور کتابیں تو چاروں طرف کھلی پڑی ہیں زندہ انسانوں کی صورت میں بھی.....ہم پڑھنا نہ چاہیں صرف نظر کر دیں تو اور بات ہے.....ان کا ذہن اس وقت اس بات پر یکسو ہو چکا تھا کہ مجھ سے اچھی تو ماسی رشیدہ ہے جس نے اپنی اولاد کو اعلیٰ اقدار سے روشناس کرایا..... چاہے زمانے کی نظر میں یہ جاہل بھی ہے مگر میرا ضمیر مضطرب تو اسے اپنے استاد کا درجہ دے گیا ہے جس نے ایک عجیب حقیقت کو منکشف کیا میرے قلب پر زندگی کے اس حصے میں!

☆.....☆.....☆

میری لائبریری سے

نام کتاب (سوانح حیات): آداب جنوں
مصنف: جسٹس (ر) چوہدری محمد شریف (مرحوم)
پبلشر: سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔

پیارے قارئین السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

آج کی کتاب .....محض کتاب نہیں، اپنے دور کی پوری تاریخ سموئے ہوئے ہے۔''بڑے لوگوں'' کو بڑے لوگ دو معنی میں کہا جاتا ہے.....ایک منصب جلیلہ یا عہدہ کی وجہ سے دوسرے خاندانی وجاہت اور حسب نسب کی بنا پر.....اس کتاب یعنی سوانح حیات کو آپ ہر دو معنی میں بڑے لوگوں کی سوانح حیات میں شمار کر سکتے ہیں.....

قارئین اسلامی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے امیر المؤمنین، سپہ سالار اور قاضی، قاضی القضاۃ کا لفظ کثرت سے پڑھتے ہیں..... بقول احسن عزیز (شہید) کے ہم ''اصطلاحی جنگ'' سے گزر رہے ہیں۔..... امیر المومنین کا پڑھتے ہی لمبی داڑھی، ماتھے پہ محراب سجائے ایک مقدس ہستی کا تصور آتا ہے..... بجا فرمایا آپ نے .....لیکن بات منصب کی ہے.....امیر المؤمنین کہتے ہیں پریذیڈنٹ کو.....سپہ سالار کشتوں کے پشتے لگانے والا مجاہد؟ ٹھیک ہے ایسے ہی سہی، عہدہ کون سا ہوا؟ چیف آف آرمی سٹاف! ایسے ہی قاضی جج اور قاضی القضاۃ چیف جسٹس آف سپریم کورٹ!!

تو پیارے قارئین آج کی کتاب ان قاضی کے بارے میں ہے جنھیں ''عادل قاضی''.....کہا جائے تو بہتر ہوگا۔روز حشر عرش کے سائے تلے جن لوگوں کی بابت حدیث مبارکہ میں درج ہے.....عادل قاضی بھی ان میں سے ایک ہے ..... ایک اور حدیث مبارکہ میں عادل قاضی (حکمرانوں کو بھی) ظل الٰہی تک قرار دیا گیا ہے.....لیکن ایک جج کے لیے عدل کرنا کتنا مشکل ہے یہ کتاب پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے.....امام ابوحنیفہ کو جب خلیفۂ وقت نے اسی چیف جسٹس کے منصب کی پیشکش کی تھی تو انھوں نے کیوں یہ فرمایا تھا۔

''امیر المومنین میں سمجھتا ہوں کہ قاضی ایسے آدمی کو ہونا چاہیے جو آپ کی اولاد، آپ کے امرا، (وزرا مراد ہیں) سپہ سالاروں اور خود آپ کے خلاف بھی فیصلہ دے سکے جبکہ میں اس کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا.....میں اپنے اندر وہ قوت ارادی نہیں پاتا کہ حق وصدق کے ضوابط کو یکساں طور پر انسانوں میں نافذ کر سکوں.....''

اسی لیے کہ ایک غلط فیصلہ روز حشر پل صراط سے نیچے گرا سکتا ہے .....ہلاکت اور بربادی کا باعث بن سکتا ہے.....حق گوئی اور عادل قاضی یہ دونوں صفتیں اکٹھی ہو جائیں تو قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

اپنی سوانح حیات کے پیش لفظ میں جناب چوہدری محمد شریف صاحب یوں رقمطراز ہیں:

''سوانح حیات یا خودنوشت یکساں معانی کی حامل ہیں نکتۂ امتیاز صرف اتنا ہے کہ دوسرے کی سوانح حیات رقم کرتے وقت اسے ہیرو بنا کر اس کے اچھے اخلاق اجاگر کیے جاتے ہیں لیکن خودنوشت میں مصنف اپنا محاسبہ خود کرتا ہے اور اپنی داخلی کیفیات و جذبات کی عکاسی کرتا ہے جس میں اس کی زندگی کے کمزور پہلو عیاں کرنے کی مجبوری لاحق ہوتی ہے۔اس خودنوشت کے آغاز میں، میں محسوس کر رہا ہوں جیسے چالیس سال عدلیہ کی صحرانوردی کے بعد خود احتسابی کے سلسلے میں اپنی عدالت میں پیشی کے صبر آزما لمحات گزارنے جا رہا ہوں۔''

پیارے قارئین اگر مصنف زندہ ہوتے تو میں بعد احترام عرض کرتی کہ حضور اب ایسے نہیں ہوتا اب اپنی خودنوشت میں تعریف کے پل

باندھے جاتے ہیں اور دوسروں کی ٹانگیں کھینچی جاتی ہیں.....(ق۔ر)

کتاب کا نام ''آداب جنوں'' کیوں رکھا گیا اس کا جواب بھی انھی کی زبانی ''آج کل کا معاشرہ کذب بیانی'' منافقت، کرپشن، حسد اور چاپلوسی جیسی خرابیوں سے مزین ہے سچائی، دیانت داری اور اصول پرستی روبہ تنزل ہیں ایسی صفات والا انسان اس زمانہ میں جنونی اور دقیانوسی جیسے القاب سے نواز جاتا ہے چونکہ یہ خوبیاں معاشرہ کے اعلیٰ کردار کے علی الرغم ہیں لہٰذا اس دیوانگی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس خود نوشت کا نام آداب جنوں، منتخب کیا گیا ہے.....

زندگی کے تین بڑے مراحل (Phases) میں بچپن، جوانی، بڑھاپا۔ اس لیے کتاب کا آغاز بھی مصنف کے بچپن سے ہوتا ہے۔ ان کا بچپن بھی ایسا ہی شاندار اور جاندار ہے جیسا کہ اس زمانے کی کسی بھی بڑی ہستی کا ہوسکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

والد محترم تین عدد بھٹہ خشت کے مالک ہونے کے علاوہ عمارتی لکڑی کا وسیع کاروبار کرتے تھے۔ میرے برادر بزرگ چوہدری غلام رسول عمر میں مجھ سے دو سال بڑے تھے، اتنا یاد ہے کہ موسم برشگال میں اودی گھٹائیں سہانا موسم لاتیں بارانِ رحمت سے کوہ شوالک سے پھوٹنے والے ندی نالے رینگنے لگتے اور پھر سے بپھر کر طغیانی کے آثار دکھاتے۔ گاؤں میں حسب توفیق سیلاب آتا اور اپنی نرم ریت بچھا جاتا اس نم آلود ریت سے ہم گھروندے بناتے یا گلی ڈنڈے کے کھیل سے دل بہلاتے۔ والدین کو مجھے مہذب بنانے کی فکر دامن گیر ہوئی تو مجھے گاؤں کے مدرسہ میں چھوڑ آئے۔ مدرسہ کی سرخ عمارت بڑے کمرہ اور برآمدہ پر مشتمل تھی اور آموں کے باغات میں گھری بہت بھلی لگتی لیکن مدرسہ کے ماحول میں اجنبیت محسوس ہوتی۔ ماسٹر صاحب کی کرخت صورت، درشت لہجہ اور کسی اور کے جگر گوشہ کی سوٹی سے سرزنش کا ہیبت ناک مظاہرہ دیکھ کر سکول سے بھاگ آیا.....

بچپن کی سہانی یادیں کتاب کے بیس صفحات پر قاری کے ''دامن دل'' کو اپنی جانب مائل رکھتی ہیں۔ شام چوراسی کے قریب گاؤں ''پھمبیاں'' میں پیدا ہونے والا یہ سپوت اپنی طالب علمی کے قصے اس دلچسپ انداز میں جزئیات نگاری اور منظر نگاری سے پیش کرتا ہے کہ قاری اس کے سحر میں کھو جاتا ہے۔.....لکھتے ہیں:

''نئی شیر دار بھینس کا دودھ یعنی بوہلی اور ہوبلو ماسٹر جی کو پلانا میری ذمہ داری تھی دودھ پی کر اور بلنڈ ڈکار لے کر دودھ کی توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے۔ محمد یاسین انھیں کبھی کبھار چاول اور عبدالغنی سویاں کھلاتا۔ چاولوں کو ماش کے آٹے کی اکڑ اور دودھ سویوں کو دودھ میں کنکھجورے کی پیرا کی سے تشبیہ دیتے۔ ایک ہندو بھٹیارن ہر سال کریلے پکا کر لاتی اس کا بیٹا گیان چند جماعت میں نالائق تھا جب بھی ماسٹر جی کا کریلے کھانے کو جی چاہتا گیان چند کی خوب مرمت کرتے اور والدہ کو حاضر ہونے کا حکم دیتے۔ دوسرے روز دھنی بھٹیارن کشاں کشاں اپنا مخصوص لہنگا لہراتی کرتے دوپٹے میں ملبوس سکول پہنچتی تو ماسٹر جی گیان چند کو بلا کر گھر کیاں دیتے اور کہتے اتنے اچھے کریلے آ رہے ہیں جب تک مصالحے بھرے کریلے ان کے پیٹ کا بار نہ بنیں گیان چند کیا خاک پڑھے گا! اپنے بچے کی پڑھائی اور ماسٹر جی کی سرزنش سے محفوظ رکھنے کے لیے دھنی بھٹیارن اپنے کھلے مطبخ میں مصالحہ بھرے کریلے اور نرم نرم پھلکیاں لاتی تو ماسٹر جی کی باچھیں کھل جاتیں۔ ماسٹر جی چٹخارے لے لے کر اور سر کو جھومنے کے انداز میں جنبش دے کر پکے کریلوں کو خراج عقیدت پیش کرتے اور دھنی بھٹیارن کو ماہر مطبخ کے نام سے نوازتے تاکہ کریلا خوری کا حق اگلے سال کے لیے محفوظ رکھ سکیں.....''

قارئین کریلوں کے چٹخارے سے یہ کتاب عدالت عالیہ کے کرارے فیصلوں تک حقائق کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ پیش لفظ میں فاضل جج نے کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے ''زیب داستان کے فن سے تہی ہونے کا جو اعتراف کیا ہے وہ محض کسر نفسی ہے حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی عدلیہ اور اس کے چھوٹے بڑے اہلکاروں کے ''اندرونی'' حقائق سے پردہ اٹھتا ہے تو ہر چیز سامنے آتی ہے۔

سناتن دھرم ہائی سکول کے جہنم زار سے نکل کر گورنمنٹ کالج ہوشیار پور میں پہنچ کر ہر مضمون، پیریڈ اور اساتذہ کرام، نیز ہوسٹل اور

ہوسٹل فیلوز کے بارے میں جسٹس صاحب مرحوم نے بہت عمدہ کردار نویسی کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''گورنمنٹ کالج میں ہر تیسرا پروفیسر پی ایچ ڈی تھا۔ ریاضی کے پروفیسر ڈاکٹر گپتا معلم کے علاوہ محقق بھی تھے۔ ڈاکٹر جین اکنامکس پڑھاتے۔ ڈاکٹر محمد احسن فاری، کبھی کبھی ڈاکٹر گپتا چھٹی پر ہوتے تو چوہدری سلطان بخش سے یہ مضمون پڑھتے۔ موسم خوشگوار ہوا تو ہم ہیر سننے کی فرمائش کرتے وہ خرابی گلا کا بہانہ بناتے تو ہم بھاگ کر ہاسٹل سے الائچیاں اٹھالاتے۔ پروفیسر صاحب نغمہ سرائی وارث شاہ کے شعر سے کرتے۔

گیا بجھ تقدیر دے نال ٹھوٹھا سانوں قسمت لے مٹ دی وے
تقدیر اللہ دی نوں کون موڑے، تقدیر پہاڑ پلٹ دی وے

چونکہ جماعت میں ہندو سکھ طلبہ بھی تھے لہٰذا ہندوؤں کی مکارانہ ذہنیت اور سکھوں کی حماقتوں کا بھرپور تذکرہ ہے۔

ہوسٹل کے کمرہ میں ایک ٹائم پیس مسلسل ٹک ٹک کی آواز نکالنے میں مصروف رہتا جب دوپہر کے بار بجنے میں ایک دو منٹ بقایا ہوتے تو گوردیال سنگھ رام سنگھ کو ہلکی سی گالی دے کر تنبیہ کرتا کہ سوئی پر سوئی چڑھنے والی ہے اپنا کچھ خیال کرو..... جواباً رام سنگھ کو بھی ہر دوسرے روز ایسی حرکت دہرانی پڑ جاتی۔

قارئین کتاب کی زبان اتنی شستہ اور عمدہ ہے کہ کسی بھی اعلیٰ پائے کے ادیب کی خودنوشت کے مقابلہ میں رکھی جاسکتی ہے۔ کتاب کے آغاز سے ہی سوانح نگار کے کثیر المطالعہ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ شاعرانہ ذوق بھی رکھتے تھے اور زمانہ طالب علمی میں اردو، فارسی میں رباعیاں بھی لکھیں۔ ایف اے کی نظم Go Lovely Rose پڑھنے کے بعد ہوشیار پور سے ملحقہ جنگل، سامنے ہرے بھرے کھیت سامنے کوہ شوالک کے پہاڑ اور نظم کہی۔

اے گلابِ خوبرو کہنا اسے
یوں نہ اپنی زندگی ضائع کرے
عالم شباب میں کیا پائے گی
دم زدن میں مثل گل کمہلائے گی
آگے آ تو دلستانی کے لیے
میرے عشق اپنی جوانی کے لیے

برادر بزرگ نے شاعری کی وہ درگت بنائی کہ شاعر نے بھی ''تک بندی'' قرار دے کر چھوڑ دیا..... زمانہ طالب علمی میں ہی تقسیم برصغیر کا نازک مرحلہ آ گیا..... جہاں ہندوؤں، سکھوں اور قادیانیوں کے خبث باطن کا پتہ چلتا ہے وہیں مصنف کی جذبہ حب الوطنی کا قابل رشک مظاہرہ بھی سامنے آتا ہے۔ سچ پوچھیں تو ایک ان پڑھ اور پڑھے لکھے کا فرق بھی ہجرت کے واقعات میں کھل کر سامنے آتا ہے۔

پاکستان آمد اور دلخراش کن مناظر دکھاتے ہوئے قلم کئی دفعہ بھیگا ہے پاکستان پہنچ کر نامساعد حالات میں بھی عزم کو توانا رکھتے ہوئے کس طرح بی اے کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا پھر مقابلے کے امتحان کی تیاری میں کیا حالات درپیش تھے۔ میرا قلم کما حقہ نہیں لکھ سکتا۔

جسٹس صاحب لکھتے ہیں:

''گیارہ ستمبر ۱۹۴۸ کو مقابلے کے امتحان کا پہلا پرچہ تھا ایف اے کا معیار مقرر کیا ہوا تھا۔ ۱۰، ۱۱ ستمبر کی درمیانی شب کبھی فراموش نہ کرسکوں گا سوگوار اور دھندلی چاندنی میں سرخی کی جھلک نمایاں تھی اور چاندنی بھیانک سی معلوم ہوتی تھی بھائی صاحب اور محمد ابراہیم کو باہر لا کر اس خوفناک چاندنی کا منظر دکھایا ہم میں سے کوئی بھی اس کی جغرافیائی توجیح نہ بتا سکا صبح جب پیپر دینے ایس اے کالج کے ہال کے باہر کھڑے تھے تو قائداعظم محمد علی جناح کی رحلت کی نامبارک خبر ہر کس و ناکس کی زبان پر تھی.....''

سوانح حیات چونکہ ایک جج کی ہے جو عدالت عالیہ کے اہم عہدے پر فائز تھا..... اس لیے اگلے ابواب میں ایل ایل بی، وکالت، وکالت کے دوران مجموعی رویوں کے بارے میں تفصیلی واقعات ہیں۔

قارئین منصب قضا یعنی جسٹس کا عہدہ عام عہدوں سے بالکل ہٹ کے اور الگ چیز ہے اس میں حکمرانوں اور امراء کی خوشنودی اور ناراضگی دونوں ہی ''عادل جج'' کے لیے تلوار ہیں۔ امام ابوحنیفہ نے اس

لیے اس منصب کو ٹھکراتے ہوئے یہ تاریخی الفاظ کہے تھے۔

''اگر مجھے دریائے فرات میں ڈوب مرنے اور قاضی کا عہدہ لینے میں سے ایک کو قبول کرنے کا اختیار دیا جائے تو میں دریائے فرات میں ڈوب مرنے کو ترجیح دوں گا.....''

قارئین عدلیہ، انتظامیہ اور فوج تینوں ہمارے ملک کے اہم ستون ہیں لیکن اگر عدلیہ کا ایک فرد بھی انصاف کے تقاضے پورے نہ کرے تو ساری بنیادیں ہل جاتی ہیں اسی لیے میرے رب نے امت مسلمہ کی پہچان ہی قرآن مجید میں 'کونوا قوامین بالقسط' دی ہے۔اس کے لیے ایک قاضی (جج) کون کون سے دباؤ کا شکار ہوتا ہے کون کون سے خوف اسے لاحق ہوتے ہیں اور کس طرح سے اسے لالچ دی جاتی ہے کتاب کے اگلے ابواب میں مصنف نے اپنی ملازمت کے دوران یہی واقعات بیان کیے ہیں۔ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے آخرت پر نظر، خدا کا ڈر، اللہ پر توکل کی کتنی ضرورت ہے اور سوانح نگار پر اللہ کا خصوصی کرم کیا تھا یہ سب ''اپنی آنکھوں'' سے یعنی 'چشم دید' مطالعہ کی ضرورت ہے۔

ہر چند ایک عادل قاضی (منصف جج) سایہ دار درخت ہوتا ہے لیکن جن کے دل و دماغ میں دنیوی دولت یا عہدوں کا خناس بھرا ہوتا ہے وہ اس سایہ دار درخت پر کیسے کیسے پتھر پھینکتے ہیں ان کی تقریباً ہر جگہ ایک ہی صورت دکھائی دیتی ہے۔ہاں جب جسٹس ایم آر کیانی، جسٹس سعد سعود جان، جسٹس سردار اقبال جیسے کھرے، حق گو انسان تھپکی دیں تو استقامت کے راستہ پر چلنا آسان ہو جاتا ہے۔جوڈیشل افسری کے دوران جسٹس صاحب زرعی اراضی، عائلی، دیوانی اور قتل وغیرہ کے ان مشہور مقدمات کی اصل حقیقت بھی بیان کرتے ہیں جو اپنے اپنے دور میں میڈیا کی زینت بنے بلکہ چھائے رہے۔کوئی بھینس چوری کا مقدمہ ہے تو کوئی قتل کا.....عبرت ناک واقعات میں بھی کہیں نہ کہیں مزاح کا پہلو نکل آتا ہے۔جسٹس صاحب والی بال اور فٹ بال کے ساتھ ساتھ ٹیبل ٹینس میں مایہ ناز حیثیت رکھتے تھے۔ان کی داستانِ حیات میں سپورٹس کلب کے شائقین کے لیے بھی بہت دلچسپی کا سامان ہے۔ایک بھرپور زندگی گزارنے کے لیے اور اپنی فٹ نیس برقرار رکھنے کے لیے سحر خیزی، وقت کی پابندی، سادہ طرزِ زندگی جیسے اصول بھی جسٹس صاحب کے امتیازی اوصاف تھے اپنے ایک ساتھی سے گفتگو میں پوچھتے ہیں:

''جب میں ملزم کو پھانسی کی سزا سناتا ہوں تو اڑتالیس گھنٹے کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا، طبیعت اچاٹ رہتی ہے۔''

فرمانے لگے:

''بیٹا سانپ مار کر بھی کوئی متاسف ہوتا ہے!.....اس کے بعد واقعی سزائے موت سنانے کے بعد ''سانپ'' کی متوقع موت پر کبھی غم و اندوہ سے دوچار نہیں ہوا۔''

قانون بنانا، قانون کے مطابق فیصلہ کرنا اور قانون نافذ کرنا تینوں مختلف النوع چیزیں ہیں۔قانون کے مطابق فیصلہ کرنے والا ہر لمحہ پل صراط پر چڑھا رہتا ہے (اگر دل میں ایمان ہو) لیکن اس کے لیے حرام سے منہ موڑنا پہلی شرط ہے.....جسٹس محمد شریف صاحب لکھتے ہیں۔ضلع ملتان آموں کی پیداوار کے لیے مشہور ہے ایک روز ایک وکیل صاحب گھر، مختلف آموں کا ٹوکرا لے آئے میں نے ان کا دل رکھنے کے لیے دو کچے آم اٹھا لیے لیکن نرمی سے انھیں کہا آئندہ ایسا نہ کرنا اور بقایا آم واپس لے جاؤ ..... ہمارے بردار بزرگ ڈاکٹر محمد عبداللہ صاحب (جو مصنف مرحوم کے خسر اور سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے معالج تھے) نے میرا رویہ پسند کیا اور کہا اگر آم لے لیتے تو اکثر وکلاء کی ارضیات میں بلاوجہ آموں کے باغ لگ جاتے۔دوسرے موسم میں ایک زمیندار ایک ٹانگہ میں تین ٹوکرے قلمی آموں کے بار کیے میرے گھر میں لے آیا۔میں نے ان سے سوال کیا میرے ساتھ والے مکان میں پروفیسر جعفری اقامت گیر ہیں سامنے کے مکان میں ایس ڈی او صاحب رہائش پذیر ہیں آپ یہ آم ان کو کیوں نہیں دیتے؟ آپ میری صحت کے بارے میں کیوں دبلے ہوتے جا رہے ہیں؟ میرے سوال پر وہ بغلیں جھانکنے لگے.....

ان دنوں میری تنخواہ پانچ صد روپے تھی مبلغ ایک صد کرایہ مکان تھا۔اخراجات خورد و نوش بل بجلی چندہ کلب کی ادائیگی کے بعد میرے

پاس مبلغ 65 روپے بقایا رہ جاتے تھے یعنی دو روپے روزانہ جیب خرچ محسوب ہوتا لہٰذا میں بازار ہی نہ جاتا اسی طرح تنگی ترشی سے گزر اوقات کی لیکن اسے اللہ کی رحمت ہی کہوں گا کہ ناجائز ذرائع آمدنی سے متنفر رہا۔

پوری کتاب میں جسٹس صاحب کے کھرے اور بے لاگ کردار کا عکس نمایاں ہے۔ فراہمی انصاف کے لیے عزیز و اقارب سے رابطہ نہ رکھنا، (سفارش نہ کردیں) ہر چہرہ کو کھوجنا کہ دوران ملاقات کسی مقدمہ کے سلسلہ میں کوئی کردار تو نہیں..... ایسا ہوتا تو جسٹس صاحب ایک ایسے روپ میں سامنے آتے ہیں جو پڑھنے والے کو سیلوٹ مارنے پر مجبور کرتا ہے..... نفع نقصان سے بے نیاز، سچا، کھرا، دبنگ، اور ایسا روپ جسے سامنے رکھ کر اقبال کی شاعری کا شعر سامنے آتا ہے'' ..... حق گوئی و بے باکی، اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی'' والا.....!!

ایک جج بھی انسان ہوتا ہے اس سے بھی غلطی ہو جائے تو کیسی صورت حال ہو؟

ایک مقدمہ قتل میں ایک ملزم کے پاؤں کسی وجہ سے سوزش زدہ تھے اسے چارپائی پر عدالت میں لایا گیا چادر میں سے اس کی آنکھیں جھانکتی نظر آئیں ایسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کی زندگی چند روزہ ہے۔ شہادت میں کافی کمزوریاں تھیں میں نے اسے بری کر دیا۔ تیسرے روز اس کے وکیل چوہدری نصیر احمد نے بتایا وہ تو سب کو دھوکہ دیتا رہا ہے بری ہوتے ہی اسے باہر چارپائی پر لایا گیا تو وہ چھلانگ لگا کر نیچے آیا اور خوشی سے رقص کرنے لگا۔ اصل قاتل وہی تھا جب گھر گیا تو رات کے وقت اس کے دماغ کی شریان پھٹ گئی اور راہیٔ ملک عدم ہو گیا۔ یہ انتقام قدرت نے اس سے لیا فطرت کی تعزیریں واقعی بہت سخت ثابت ہوئیں۔

قارئین کھٹے میٹھے لوگوں اور تلخ و شیریں یادوں کے ساتھ ساتھ کتاب کے آخر میں ''حج نامہ'' بھی پڑھنے کو ملتا ہے جو مصنف اور ان کی اہلیہ کی داستانِ حج ہے..... بلا مبالغہ اردو کے مختصر سفرناموں میں یہ ایک اچھا مختصر مگر جامع سفرنامۂ حج شمار کیا جا سکتا ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد سرکار نے مصنف کو فوری سماعت کی عدالتوں کے ملتان بنچ کا نگران مقرر کیا..... کتاب کا آخری باب اسی کی داستان پر مشتمل ہے..... کتاب کا کوئی باب ایسا نہیں جس سے سرسری گزرا جا سکے ..... حلال روزی کمانے کے لیے کون کون سے وصف کا ہونا لازمی ہے اور کون کون سے ''موذی امراض'' اس کی راہ میں حائل ہو سکتے ہیں ..... جاننا چاہتے ہیں اور میرے خیال میں جو بھی کسی منصب پر ہے اسے اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے ..... اللہ کے بندوں کو انصاف فراہم کرنے اور اس کی مطلوبہ شرائط پر پورا اترنا بھی ولایت کی نشانیوں میں سے ہے۔ یہ کتاب ضرور خریدیے، مطالعہ کیجیے اور لوگوں کو کتاب کی اہمیت سے آگاہ کیجیے۔

خدا رحمت کُند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اگلے کالم تک کے لیے اجازت۔

فی امان اللہ۔

☆.....☆.....☆

محبت کا بہتا زم زم

آسیہ باجی محبتیں بانٹنے میں انتہائی اعلیٰ ظرف ہیں، جنہوں نے محبتیں بانٹتے ہوئے کبھی بھاؤ تاؤ نہیں کیا۔ ہمیشہ صلہ رحمی اور الفت ومحبت کے اظہار میں پہل ان کا خاصہ رہی۔ سراپا شفقت!! جن کی صحبت میں مجھے ہمیشہ ایک بڑی بہن کی رفاقت میسر آئی ہے اور میں ان کی محبتوں کے پیمانے کو نہ ناپ سکتے ہوئے یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہوں کہ وہ میری بہن ہیں یا صہیب کی۔

مجھے کہہ رہی ہیں کہ خدیجہ میرا دل چاہتا ہے کہ تمہارے گلے لگ جاؤں! تم ابّا جان کے بارے میں لکھو، کیا معلوم ان کی شخصیت کی کوئی کرن، کسی زندگی کو منور کر جائے!

آسیہ باجی آنسو بار بار حائل ہو رہے ہیں کچھ لکھنے سے قبل ہی۔ لیکن آپ کے فرمان کو ٹالنا میرے لئے ناممکن ہے۔

خاندانی اعتبار سے ہمارا تعلق قریش کی شاخ بنو ہاشم سے ہے۔ اور ہمارا سلسلہ نسب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد بن حنفیہ سے جا ملتا ہے۔ ابا جان محترم پروفیسر الیف الدین ترابی رحمہ اللہ تعالیٰ نے مقبوضہ کشمیر کے ضلع پونچھ کے ایک گاؤں نابناں میں 27 اگست 1941ء کو ایک دیندار گھرانے میں جنم لیا۔ ابا جان کے نانا میاں امام بخش مرحوم ایک معروف عالم دین تھے اور والدہ حسین بی بی نہایت عابدہ وزاہدہ خاتون۔ اسی طرح ابا جان کے والد مرحوم (ہمارے دادا جان) عالم دین قریشی بھی ایک دیندار شخص تھے اور عابد شب زندہ دار تھے۔ ان سب کا نمایاں اثر ابا جان کی شخصیت پر مرتب ہوا اور ابا جان کا رجحان بچپن سے ہی دین کی طرف ہو گیا۔ خود میں نے جب ہوش سنبھالا تو دادا جان دنیا سے رخصت ہو چکے تھے البتہ دادی جان حیات تھیں۔ میں نے دادی جان کو ہر لمحہ مصروف عبادت دیکھا۔ وہ دن رات میں کئی کئی نوافل پڑھ لیتیں۔ قرآن مجید کے کئی کئی پاروں کی روزانہ تلاوت کرتیں۔ اپنے پاس دم کے لئے پانی رکھا ہوتا جس پر تلاوت کے بعد بڑے اہتمام سے دم کرتیں اور جو بھی دادی جان کے پاس آ کر بیٹھتا بطور مہمان نوازی اسے اپنا دم کیا ہوا پانی پیش کرتیں۔ تادمِ آخریں اپنے تمام ذاتی کام خود نبٹاتی رہیں۔ حتی کہ اپنے بستر کی چادر بھی خود دھوتیں۔ پاکیزگی کا حد درجہ اہتمام کرتیں۔ ان کی زبان سے میں نے کبھی کسی کا ذکر بد نہیں سنا۔ دادی جان کی ان تمام صفات کا وافر حصہ ابا جان کو ورثے میں ملا۔ اور پھر اعلیٰ دینی و دنیاوی تعلیم نے ان خوبیوں کو مزید چار چاند لگا دیئے۔

ابا جان کی شخصیت محبت کا بہتا زم زم تھی۔ جس کے کنارے آ کر اپنے اور غیر سبھی بیٹھتے اور تسکین حاصل کرتے۔ اسی چشمہء صافی سے ہر کسی کو بلا کم وکاست اپنا اپنا حصہ ملتا۔ یہ گواہی ابا جان کے جنازے میں آئے ہوئے ہر شخص نے دی ہے۔

یہی گواہی میرے پاس بیٹھی ہوئی منزہ دے رہی ہے۔ ضلع جھنگ سے تعلق رکھنے والے ابا جان کے انتہائی قریبی اور دیرینہ دوست محترم گوہر صدیقی صاحب کی بیٹی! گوہر صدیقی صاحب کے ساتھ ابا جان کا کم وبیش چالیس سالہ انتہائی قریبی دوستی ومحبت کا تعلق استوار رہا ہے۔ منزہ کہہ رہی ہے": خدیجہ باجی! ابا جان، چچا جان کی وفات کا سن کر خوب خوب روئے ہیں۔ وہ دیر تک ہمیں چچا جان کے ساتھ اپنے تعلق ودوستی کے واقعات سناتے رہے ہیں۔ ابا جان کہہ رہے تھے میں نے اپنی زندگی میں بہت سے ملنسار افراد دیکھے ہیں۔ مگر ترابی صاحب تو محبت میں گندھے ہوئے تھے۔"

یہی گواہی نوید بھائی (صائمہ بھابھی کی بہن شمسہ کے میاں) نے دی ہے کہ "باجی! میں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے جنازے دیکھے

ہیں مگر میں سچ کہہ رہا ہوں کہ میں نے کسی جنازے میں اس طرح دھاڑیں مار مار کر لوگوں کو روتے ہوئے نہیں دیکھا!

ابا جان اپنے والدین کی سب سے بڑی اولاد تھے۔ آپ سے چھوٹے تین بھائی اور ایک بہن تھی۔ ابا جان نے ابتدائی تعلیم اپنے والدین اور ماموں جان سے حاصل کی اس کے بعد قریبی گاؤں موضع لسانہ میں واقع پرائمری سکول سے اعزاز کے ساتھ پرائمری کا امتحان پاس کیا اور پورے علاقے میں اول رہے۔ جس کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول سرن کوٹ سے اعزاز کے ساتھ مڈل کا امتحان پاس کیا اور جموں و کشمیر تعلیمی بورڈ میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی ۔ 1960 میں اسی سکول سے اعزاز کے ساتھ میٹرک کیا اور پورے ضلع میں اول رہے۔ ابا جان کسی وجہ سے میٹرک کے امتحان کا ایک پرچہ نہ دے سکے تھے ورنہ ابا جان کو یقین تھا کہ اگر وہ پرچہ دے دیتے تو پوری ریاست میں اول آتے۔

1964ء میں جب ابا جان تعلیم کی تکمیل کے لئے سری نگر گئے تو وہاں ابا جان کی ملاقات وادئ کشمیر کے دو افراد محمد شعبان بٹ اور محمد سلطان سے ہوئی جو جماعت اسلامی سے وابستہ تھے۔ ابا جان ان کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوئے اور جماعت اسلامی سے وابستگی اختیار کر لی۔

1965ء میں ابا جان نے ہجرت کرنے کے بعد آزاد کشمیر میں سکونت اختیار کر لی۔

1970ء میں جناب سردار محمد عبدالقیوم خان کے آزاد کشمیر کا صدر بننے کے بعد ابا جان محکمہ اطلاعات آزاد کشمیر سے بحیثیت آفیسر وابستہ ہو کر مظفر آباد چلے گئے۔ ابا جان نے اسی دوران افسر اطلاعات کے ساتھ ساتھ جناب سردار محمد عبدالقیوم خان کے پی آر او کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔ 1978ء میں ابا جان نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ میں داخلہ لے لیا۔

مکہ مکرمہ میں ہمارا گھر تحریک آزادی کشمیر کی محترم شخصیات کا مرکز تھا۔ ان میں نمایاں شخصیات محترم پروفیسر ایوب ٹھاکر مرحوم (جو اس وقت جدہ یونیورسٹی میں پڑھا رہے تھے)، محترم غلام نبی فائی اور محترم حسام الدین شہید کی ہے۔ تمام پاکستانی طلبہ کے لئے بھی ہمارا گھر مرکز تھا اور ابا جان کی ذات سب کے لئے مہربانی اور شفقت کا پیکر۔ امی جان ابا جان کے ایماء پر ہر لمحہ مہمان داری کے لئے کمر بستہ رہتیں۔ پاکستانی کھانے اور مہمان نوازی پاکستانی طلبہ کے لئے کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھی۔ چنانچہ ہمارا گھر پاکستان ہاؤس کے نام سے مشہور تھا۔

مجھے آج بھی یاد ہے کہ ہمارے چھوٹے سے اس گھر میں مہمانوں کی اتنی کثرت ہوتی تھی کہ ہم کئی کئی روز تک ڈرائنگ روم تک نہ جا پاتے۔ جدہ اور ریاض وغیرہ سے عمرہ کے لئے آنے والے احباب کے لئے یہ اطمینان کافی ہوتا کہ مکہ میں ترابی صاحب کا گھر ہے۔ ہندوستان اور پاکستان سے آنے والے ہمارے تمام رشتہ دار بھی ہمارے ہی گھر آ کر ٹھہرتے۔ اس وقت پاکستانی کمیونٹی کے تمام بچے مکہ میں پاکستانی سکول مدرسہ صولتیہ میں پڑھتے تھے۔ ہم بھی کچھ عرصہ وہاں زیر تعلیم رہے اور پھر ابا جان نے ہمیں عربی اسکولز میں داخل کروا دیا۔ جس سے ہم سب بہن بھائیوں کو عربی پر دسترس حاصل ہو گئی۔

1984ء میں جب ہم نے پاکستان کی طرف واپسی کے لئے رخت سفر باندھا تو ابو کی ساری محبتوں کا بھرپور صلہ انہیں پاکستانی کمیونٹی کی جانب سے ملا۔ ابو کے لئے الوداعی پارٹی کا اہتمام کیا گیا اور ابو کو ان کی تمام خدمات کے لئے سپاسنامہ پیش کیا گیا جس میں ایک نظم بھی شامل تھی۔ جس کے چند بول یہاں پیش کرنے کا مقصد ابا جان کے لئے پاکستانی کمیونٹی کی محبت کی ایک جھلک دکھانا ہے۔

اے ہمارے دل کی دھڑکن اے ترابی محترم
الوداع کہتے ہیں با قلب حزیں با چشم نم
آپ کی ذات گرامی تھی ہمارے درمیان
خلق کا مینار روشن، عظمتوں کی پاسبان !!
یوں بظاہر پرسکون و مطمئن رہتے ہیں آپ
حکم اسلامی کی خاطر مضطرب رہتے ہیں آپ
چہرہ گہرے پانیوں کی سطح کی طرح خموش

موجزن دل میں مگر پرجوش طوفان خروش
جامعۃ ام القری میں علم کے موتی چنے
علم سے ہو کر مسلح جانب میداں چلے
منہ نہ موڑوں گا کبھی لے کر یہی پیماں چلے
دیکھ کر عابدؔ انہیں ہر کوئی یہ دہرائے ہے
یہ نصیب اللہ اکبر! لوٹنے کی جائے ہے

موجودہ تحریک آزادیِ کشمیر کے ساتھ ہی ابا جان نے اسلام آباد میں کشمیر انفارمیشن سنٹر کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور تحریک آزادء کشمیر کے میڈیا کے محاذ پر خدمات سرانجام دینے لگے۔ چنانچہ مجلّہ کشمیر المسلمہ کے نام سے عربی زبان میں ایک ماہنامہ پرچہ جاری کیا۔ نیز عربی زبان میں مسئلہ کشمیر کے بارے میں 15 سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں۔

اس سلسلے میں ابا جان نے متعدد بیرونی ممالک بالخصوص سعودی عرب، کویت، قطر، عرب امارات، یمن، شام، اردن، عمان، ترکی، مصر، لیبیا، سوڈان، مراکش وغیرہ کے بارہا دورے کیے۔ چنانچہ ان ممالک کی اسلامی تحریکوں کے سربراہان سے ابا جان کا نہایت قریبی تعلق تھا۔ سعودی عرب کے شاہ عبداللہ اور آئمہ حرمین سے بارہا ملاقاتیں کیں اور بہت سی اسلامی کانفرنسز میں شرکت کی۔

اس کے بعد 2005 میں اسلام آباد میں ہی انٹرنیشنل انسٹیٹیوٹ آف سٹریٹیجک سٹڈیز اینڈ ریسرچ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جو مسلم امہ کو درپیش چیلنجوں اور مسائل کے حوالے سے ریسرچ سٹڈیز تیار کر رہا ہے۔ اس ادارے نے اب تک 100 کے قریب ریسرچ سٹڈیز تیار کی ہیں جن میں سے 33 کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے 23 ریسرچ سٹڈیز عربی زبان میں ہیں, 9 اردو میں جبکہ دو انگلش میں ہیں۔ ان میں سے عربی زبان میں شائع ہونے والی 23 ریسرچ سٹڈیز میں سے 20 ابا جان کی تیار کردہ ہیں اور اردو زبان میں تیار ہونے والی 7 ریسرچ سٹڈیز میں سے 4 ابا جان کی تیار کردہ ہیں۔

ابا جان کی طبیعت میں بے پناہ نفاست تھی اور ذاتی اشیاء کی ترتیب میں بے حد صفائی کا اہتمام کرتے۔ میں آپ کی فائلوں اور کاغذات کی ترتیب میں ہی صفائی اور ترتیب دیکھ کر دنگ رہ جاتی۔

ابا جان کے پاس کوئی اعلی درجے کا انسان آتا یا کوئی عام شخص، آپ ہر آنے والے کو بھرپور توجہ اور اہتمام دیتے۔ اس کے ذاتی مسائل کے حل کے لئے اپنی خدمات پیش کرتے اور دوسروں کے مسائل کو حل کر نیمیں سکون محسوس کرتے۔

صلہ رحمی اور تعلقات قائم رکھنے میں ایثار و قربانی کی بے نظیر مثال تھے "جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں، جو مجھے محروم کرے میں اسے دوں، جو مجھ پر ظلم کرے میں اسے معاف کروں" کی عملی تصویر تھے۔

نامساعد حالات میں راستہ بنانے کا ہنر بخوبی جانتے تھے۔ ساری عمر سمجھ کر مشکلات کا مقابلہ کیا۔ بڑی سے بڑی ناموافق صورت حال سے بھی کامیابی کے ساتھ نبرد آزما ہوئے۔ گویا
مشکلیں جب تک رہیں ذوقِ سفر بڑھتا گیا۔

اپنے سارے بچوں سے، بیٹے بیٹیوں سے بے پناہ محبت تھی۔ بچوں کی لغزشوں کو بے پناہ وسعت قلبی سے معاف فرماتے اور امی جان کو بھی اسی کی تلقین کرتے۔ میری اور بھائی جان کے درمیان نوک جھونک ہوتی تو ہمیشہ بھائی جان کو سمجھاتے۔ رشتہ داروں میں امیر غریب کی کوئی تخصیص نہیں تھی، کھڑے ہو کر استقبال کرتے اور آگے بڑھ کر بغلگیر ہوتے۔ ان کے ذاتی مسائل انتہائی رازداری کے ساتھ حل کرتے۔ ایسا ممکن نہ تھا کہ کوئی اپنا ذاتی مسئلہ لے کر ابا جان کے پاس جائے اور پھر وہ اسے اپنا ذاتی مسئلہ سمجھ کر حل کرنے کی حتمی کوشش نہ کر ڈالیں۔

دوسروں کی رائے کو حد درجہ اہمیت دیتے اور اگر دلیل سے اس کی معقولیت واضح ہو جاتی تو اپنی رائے کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہوتی اس سے دست بردار ہونے میں ایک لمحہ نہ لگاتے۔ ضد، بے جا ہٹ دھرمی اور انا پرستی کا شائبہ تک نہ تھا۔ زندگی واضح نصب العین کے ساتھ گزاری اور نصب العین سے لگاؤ میں عزیمت کے درجے تک رہے۔

نماز نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ پڑھتے ، میں جب پانچ چھ برس کی تھی تو محویت کے ساتھ ان کو نماز پڑھتے دیکھتی رہتی۔ ساری عمران کی نماز میں محویت کا یہی عالم رہا۔ نماز پڑھتے ہوئے اللہ کے حضور خوب گڑگڑاتے۔

دعاؤں کا ہر معاملے میں غیر معمولی اہتمام کرتے۔ کبھی بھی کوئی مشکل پیش آئی کبھی کسی انسان کے سامنے دست سوال دراز نہ کیا۔ اللہ کے سامنے اپنی حاجات پیش کیں اور انسانوں سے آخری درجہ تک بے نیاز رہتے۔

ابا جان کو اپنی زندگی میں مختلف جگہوں میں رہائش اختیار کرنا پڑی مگر جہاں بھی رہے اردگرد کے ماحول اور افراد پر اپنا نہ فراموش ہو سکنے والا تاثر چھوڑا۔ 1968ء سے 1970ء تک گجرات میں بطور پرنسپل تعینات رہے آج اس واقعے کو لگ بھگ 45 سال بیت چکے ہیں مگر اس محلے کی ایک خاتون آئیں اور فطور محبت سے ابا جان کا حوالہ دیتے ہوئے بتانے لگیں "ہجرت کے بعد ترابی صاحب نے سب سے پہلے ہمارے محلے جلال پور جٹاں کو دعوت دین کا مرکز بنایا تھا۔"

1968ء سے 1977ء تک ابا جان آزاد کشمیر میں مختلف جماعتی اور حکومتی ذمہ داریوں پر فائز رہے۔ میں سعودیہ سے واپسی پر کئی سال کے گیپ کے بعد 1987ء میں ایک مرتبہ ابا جان کے ہمراہ آزاد کشمیر گئی تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ کوئی خاص و عام ایسا نہ تھا جو ابو کو پہچانتا نہ ہو اور والہانہ آگے بڑھ کر بغل گیر ہونے کے لئے بے تاب نہ ہو۔

دنیا میں اس طرح رہو جیسے اجنبی، راہ چلتا مسافر!! چنانچہ ابا جان کی ذاتی ضروریات بے حد مختصر اور سادہ تھیں البتہ دوسروں کے لئے انتہائی زیادہ وسعت قلبی تھی۔ دوسروں کو آسانیاں فراہم کرنا اور آسائشیں مہیا کرنا انہیں حد درجہ محبوب تھا۔ اپنی محبوب غذا سبز چٹنی اور لسی کے ساتھ سادہ روٹی تھی اور تادم آخر یہی غذا محبوب رہی۔

امی جان بتاتی ہیں کہ اوائل عمری اور جواں عمری میں صحت قابل رشک حد تک اچھی رہی۔ کبھی معمولی سر درد بھی نہ ہوتا۔ بعد ازاں آخری بیس سالوں کے دوران دل کا مسئلہ، شوگر اور بلڈ پریشر نے یکبارگی حملہ کیا مگر پرہیز اور اعتدال کے باعث معاملہ کنٹرول میں رہا۔ البتہ آخری ایک سال صبر آزما بیماری کے ساتھ نبرد آزما رہے۔ یہ تمام عرصہ نہایت صبر و عزیمت کی تصویر بنے رہے اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتے۔ جو بھی حال احوال پوچھنے آتا جواباً یہی فرماتے۔ "الحمدللہ! اللہ کا شکر ہے"

میری چھوٹی دونوں بہنیں زہراء اور عائشہ آسٹریلیا میں ہوتی ہیں، دونوں نے باری باری بچوں سمیت آکر ابا جان کی تیمارداری میں حصہ لیا۔

زہرا کو اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ پھر موقع دیا اور وہ ایک ماہ قبل دوبارہ ابا جان سے ملنے آئی اور ابا جان کے انتقال سے محض پانچ روز قبل ہی واپس روانہ ہوئی۔ زہرا کی کوشش رہی کہ جب تک وہ پاکستان میں ہے ایک ایک لمحہ ابا جان کے ساتھ صرف کرے۔ میں اسے کہتی "زہرا کچھ وقت کے لئے میرے گھر آؤ" زہرا کا جواب ہوتا "باجی میں چاہتی ہوں میرے پاس اگر ایک سیکنڈ بھی ہے تو وہ بھی میں ابا جان کے ساتھ بسر کروں!"

اس سے پچھلی مرتبہ جب زہرا آئی تھی تو جاتے ہوئے عفراء (زہرا کی بڑی بیٹی) زار زار رو رہی تھی غالباً اسے اندازہ تھا کہ شائد آئندہ وہ نانا جان کو نہ دیکھ سکے۔

عفراء نے رواں انگریزی میں بڑی ہی خوبصورت نظمیں لکھی ہیں۔ اس نے ابا جان کی شخصیت پر بھی ایک بڑی خوبصورت طویل نظم ابا جان کی زندگی میں ہی لکھی تھی۔ آسٹریلیا میں رہتے ہوئے بھی زہرا نے ماشاءاللہ بچوں کی تربیت میں جو نمونہ پیش نظر رکھا وہ لائق تقلید ہے۔

عائشہ کے چاروں بچوں عمار، بشار، ھدیٰ اور بیٹال سے بے حد پیار کرتے، بشار کو چودھری صاحب کہہ کہ مخاطب کرتے۔ عائشہ کا چھوٹا بیٹا بیٹال اور ساجد کا بیٹا طٰہٰ ہو بہو ابا جان کی تصویر ہیں۔ بیٹال کی پیدائش سے چند ماہ قبل عائشہ ابا جان سے ملنے آسٹریلیا سے آئی۔ عائشہ کو سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے ویسے ہی ابا جان "چاند بیٹا"

کہہ کہ مخاطب کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ طٰہٰ اور بیٹال اپنے دادا جان اور نانا جان کی صورت کے ساتھ ساتھ سیرت سے بھی پورا پورا حصہ وصول کریں۔

ابا جان نے مجھے لکھنا سکھایا۔ میں بہت چھوٹی سی تھی غالباً آٹھویں کلاس میں، جب ابا جان کو الٹی سیدھی تحریر لکھ کر پیش کرتی اور وہ اس کی نوک پلک سنوارتے۔ نہ جانے وہ اتنی بے تحاشا مصروفیات میں سے ہمارے لئے اتنا زیادہ اور بھرپور وقت کہاں سے لے آتے تھے کہ میں نے اپنے قریبی سرکل میں اس قدر توجہ اور اہتمام کرنے والے والد کو نہیں دیکھا۔ جب میں سات برس کی تھی تو ہم لوگ آزاد کشمیر (پلندری) سے سعودیہ منتقل ہو گئے۔ ہم سب بہن بھائیوں کو ابا جان فرداً فرداً خود پڑھاتے۔ حالانکہ اس وقت وہ خود ام القری یونیورسٹی سے ایم فل کر رہے تھے اور ساتھ ہی آزاد کشمیر جماعت کی جانب سے پورے سعودی عرب کی نظامت کی ذمہ داری بھی ادا کر رہے تھے۔ مگر انہوں نے زندگی کے ہر موڑ پر، ہر ہر قدم پر ہمیں بے حد وحساب محبتوں اور بھرپور توجہ سے نوازا۔ میری خواہش ہی رہی کہ کاش میں اپنے بچوں کے ساتھ اس درجہ کی زبان کی شیرینی، وہ محبت، وہ لطافت اور اس درجہ کی توجہ کا کوئی ادنیٰ سا حصہ ہی صرف کر سکوں جو میرے ابا جان کا خاصہ تھی!!

حتی کہ میں نے اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ ابا جان کی خدمت میں بطور نمونہ پیش کیا تو ابا جان نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود اس کی زبان و بیان کی غلطیوں کو اپنے ہاتھ سے درست کیا۔ حالانکہ اس حوالے سے ابا جان کو تکلیف دینا میرے پیش نظر نہ تھا۔ مگر جب میں دوبارہ ابا جان سے ملنے گئی تو ابا جان نے مسودے میں جا بجا تصحیح کی ہوئی تھی۔

میں جتنا بھی یاد کرنا چاہوں مجھے یاد آ کر نہیں دیتا کہ ابا جان نے کبھی ہمیں ڈانٹا ہو یا سخت سست کہا ہو۔ کسی بات پر بہت رنجیدہ یا برہم ہوتے تو ان کی سرزنش کی آخری حد یہ الفاظ ہوتی "بیٹا جی"!! اور سننے والے کو معلوم ہو جاتا کہ وہ کچھ اچھا نہیں کر رہا۔

امی جان کے ساتھ ان کا رویہ بے حد مثالی تھا۔ امی جان کے پاس جب بھی بیٹھے ہوتے ابا جان کی بذلہ سنجی جوبن پر ہوتی۔ اکثر مزاح پیدا کرنے کے لئے استعاراتی زبان استعمال کرتے۔ کہتے میری پھوپھو کی ایک بیٹی ہے (مراد امی جان ہوتیں) اور پھر امی جان کے حوالے سے بات مکمل کرتے۔

فون پر امی جان سے بات کروانی ہوتی تو اگلے بندے کو حیرت میں مبتلا کرنے کے لئے کہتے: "یہ ایک خاتون یہاں بیٹھی ہوئی ہیں آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں (مراد امی جان ہوتیں)۔"

ہم جب بھی ابا جان سے براہ راست مشورہ طلب کرتے تو امی جان کی طرف متوجہ کر کے کہتے والدہ کے تین حصے ہیں پھر میری باری ہے۔ اس معاملے میں آپ کی والدہ صاحبہ کی رائے ہی میری رائے ہے۔

امی جان کو لکھنا پڑھنا ابو نے سکھایا۔ حروف تہجی سے لے کر رواں اردو تک سارا سفر ابو نے خود طے کروایا۔ ہم سعودیہ میں تھے تو امی جان کو قرآن مجید ترجمے کے ساتھ خود سکھانا شروع کیا۔ بعد ازاں امی جان نے مختلف افراد سے دھرائی کر کے ترجمہ پختہ کیا۔

بہوؤں کو ہمیشہ بیٹا جی کہہ کر مخاطب کرتے۔ بیٹے اور بہو میں اگر کوئی تکرار ہو جاتی تو بیٹوں کو ہی سمجھاتے: "بیٹا جی! میں نے کبھی آپ کی والدہ سے اس میں بات نہیں کی"!!! اور واقعی نہیں کی ہم نے ہمیشہ انہیں والدہ کے ساتھ شہد جیسے شیریں لہجے میں بات کرتے ہوئے پایا۔

پوتوں اور نواسوں سے حد درجہ محبت کرتے۔ بچے بلا تکلف ابا جان کے کندھوں پر چڑھ دوڑتے۔ بچوں کو خوب پیار کرتے۔ خود بھی بچوں سے بوسہ لیتے اور بچوں کو بھی بوسہ دیتے۔

شوگر کے باوجود کھانے میں دیر سویر ہونے پر کبھی احتجاج نہ کرتے فوراً ڈرائی فروٹ یا بھنے ہوئے چنوں کا سہارا لے لیتے۔

آخر وقت تک حتی المقدور نماز باجماعت کا مسجد میں ادائیگی کا اہتمام رہا۔ آخری ایک سال جب صحت بالکل جواب دے گئی تو اشاروں سے نماز کی ادائیگی کا سلسلہ جاری رکھا۔ آخری ایک سال بیماری

کا انتہائی صبر اور استقلال سے سامنا کیا۔ اللہ تعالیٰ اس بے پناہ صبر کا انہیں بے حد وحساب اجر دے۔ ان کی لغزشوں کے کفارے اور درجات میں بے حد وحساب بلندی کا ذریعہ بنائے۔ آمین ثم آمین۔

اللہ تعالیٰ نے میرے دونوں بھائیوں کو ابا جان کی خدمت کا بہترین موقع دیا۔ اور ان کی اولاد کو بھی۔ بیماری کے تمام عرصہ میں امی جان جو خود بھی شوگر، بلڈ پریشر اور جوڑوں کے درد کی دائمی مریضہ ہیں، اپنی تمام بیماریوں کو پس پشت ڈال کر کسی ٹین ایجر لڑکی کی طرح ابا جان کی خدمت پر کمر بستہ رہیں۔ اسی طرح میری پھوپھو جان نے بیٹی اور بہن کا ڈبل کردار ادا کیا۔

سعد ابا جان کا بڑا پوتا، جس کی اٹھان میں مجھے ابا جان کی شخصیت کی بڑی نمایاں جھلک نظر آتی ہے سب اولاد پر بازی لے گیا۔ وہ کسی نوزائیدہ بچے کی طرح انتہائی محبت سے دادا جان کو اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھاتا۔ ان کے تمام کام انتہائی مستعدی اور محبت سے انجام دیتا مگر اس کی تشنگی دور نہ ہوتی ابا جان جب سو جاتے تو ان کے پاؤں اور ہاتھ چومتا!!

قانتہ، ابا جان کی بڑی پوتی، سعد کی بہن اور جاوید بھائی کی بیٹی، جس کے اندر میری شہید بہن عذرا کی روح پوری طرح جھلکتی محسوس ہوتی ہے۔ اور میں اسے عذرا ہی کا نیا روپ کہتی ہوں، نے کس قدر محبت کے ساتھ دادا جان، دادی جان کے ساتھ بیماری کے تمام لمحات گزارے ہیں۔ صبح صبح ابا جان کی آنکھ کھلتے ہی قانتہ کی مسکراتی ہوئی آواز گونجتی: "السلام علیکم! پروفیسر الیف الدین ترابی صاحب!! آپ نے مجھے پہچانا! میں قانتہ ہوں" اور ابا جان مسکراتے ہوئے تائید میں سر ہلاتے۔ امتحانات ہوں یا کچھ اور اس کے لئے سب سے پہلی ترجیح دادا جان رہے۔

ساجد کے بچے اسماء، اسامہ، سمیہ اور طہٰ چھوٹے ہیں مگر، ساجد دن میں دو دفعہ یخنی اور ابا جان کا پرہیزی کھانا لے کر سیکٹر آئی ٹین سے سیکٹر جی ٹین جاوید بھائی کے گھر آتا۔ بچے لپک کر ابو کے بیڈ پر چڑھ دوڑتے اور دادا جان کو چومنا شروع کر دیتے۔ یہ محبتیں دراصل ابا جان نے ہی انشورنس کروا رکھی تھیں۔ انہوں نے اپنے پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں کو بے حد وحساب محبتیں دی ہیں۔ جو آج ان کے اکاؤنٹ میں ملٹی پلائی ہو کر واپس آ رہی تھیں۔

میرے بچوں میں سے علی کتابیں پڑھنے کا بے حد شوقین تھا۔ اس کے ذوق وشوق کو دیکھ کر ابا جان نے اسے "چھوٹے الیف الدین" کا ٹائٹل دے رکھا تھا۔ علی جب بھی ابا جان کے پاس جاتا ابا جان پوچھتے: "ہاں تو کون صاحب تشریف لائے ہیں؟" اور علی مسکرا کر کہتا "چھوٹا الیف الدین آیا ہے"

مریم اور طوبیٰ کو بے حد شفقت اور محبت دی۔ ایک مرتبہ میں بیمار تھی، مریم نانا جان سے ملنے گئی۔ مریم سے میرے متعلق پوچھا: "ماما کیسی ہیں؟" مریم نے جواب دیا: "ماما بہت اچھی ہیں مگر ماما کی طبیعت اچھی نہیں ہے مریم کا یہ جواب سن کر بہت محظوظ ہوئے اور آئندہ جب بھی میری صحت کا پوچھتے مریم کی اس بات کا حوالہ ضرور دیتے۔

میری بیٹی طوبیٰ کے بچوں آدم اور عبداللہ سے بے حد محبت کرتے۔ میری سب سے چھوٹی بیٹی رملہ جو اپنے بھانجے آدم سے صرف تین ماہ بڑی ہے کو "چھوٹی خالہ جان" کا ٹائٹل دے رکھا تھا۔

حد درجہ جسمانی نقاہت کے باوجود ذہنی استعداد تا دم آخریں بھر پور رہی۔ وفات سے چند ماہ قبل کویت سے نکلنے والے عربی ماہنامے کے مطالبے پر کچھ تحریر کروانا تھا۔ مجھے قلم کاغذ لے کر لکھوانے لگے اور ساتھ ساتھ واضح کرتے جاتے، یہاں فل سٹاپ لگاؤ، کومہ ڈالو، نیا پیرا گراف شروع کرو۔ تحریر مکمل ہو جانے کے بعد جب میں نے اسے پڑھا تو بیماری کے اس عالم میں بھی ابا جان کے خیالات کی روانی، الفاظ کے انتخاب اور تحریر کے تسلسل کو دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ حالانکہ جس نقاہت سے ابّا جان لکھوا رہے تھے میں بڑی ہی مشکل سے ان کے الفاظ کو سمجھ پا رہی تھی۔ اسی بیماری کے دوران میری بیٹی مریم سے مصر میں اخوان المسلمین پر مظالم کے حوالے سے تجزیاتی مضمون قلمبند کروایا۔

سید قطب رحمہ اللہ کے چھوٹے بھائی محمد قطب رحمہ اللہ جن سے ابا جان نے ام القریٰ سے ایم فل کے دوران براہ راست شاگردی وتلمذ کا شرف حاصل کیا تھا، کی رحلت پر اسی بیماری کے عالم میں مضمون قلم بند کروایا۔ چند ماہ قبل مجید نظامی مرحوم کی رحلت کے سانحے پر کشمیر کاز کے لئے مرحوم کی خدمات پر مضمون قلمبند کروایا۔ آخری سالوں میں ابا جان نے ایک خاص perspective سے سیرت النبی ﷺ لکھنی شروع کی تھی۔ جس کی تکمیل کی ذمہ داری ابا جان نے میرے ناتواں کندھوں پر ڈالی۔ اس کے synopsis ابّا جان نے خود تیار کیے اور غزوہ احد تک سارا کام بھی خود مکمل کر لیا۔ بیماری کے دوران بہت باقاعدگی سے مجھ سے سیرت پر کام کے رپورٹ طلب کرتے رہے۔ "مؤمن اپنے رب سے تھکا ہوا ملتا ہے" کے مصداق زندگی کے آخری لمحے تک ابا جان کی جدوجہد کا سفر جاری رہا۔ آخری روز دوپہر 12 بجے سے لے کر بعد از نماز عشاء ساڑھے نو بجے تک میں شفا انٹرنیشنل ہاسپٹل کے انتہائی نگہداشت کیوارڈ میں ابا جان کے پاس تھی۔ ابا جان نے چند لمحات کے لئے آنکھیں کھولیں۔ میں نے عرض کی "ابا جان: میں اپنے سارے کام پس پشت ڈال کر آپ کے سپرد کردہ سیرت کے کام کی تکمیل کے لئے کوشاں ہوں۔ آپ دعا کیجئے گا" ابا جان نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

28 دسمبر 2014ء بمطابق 5 ربیع الاول 1436ھ نبی کریم ﷺ کے سچے عاشق زار نے عین تہجد کے وقت اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ انتقال کے وقت میرے چھوٹے بھائی ساجد ابا جان کے ساتھ کھڑے مسلسل کلمہ ءشہادت کا ورد کر رہے تھے۔ ابا جان نے شہادت کی انگلی بند مٹھی سے باہر نکالتے ہوئے اعلان شہادت کے انداز میں اپنا ہاتھ بلند کیا اسی لمحے ابا جان کی روح قفس عنصری سے نکل کر رب کی دائمی جنتوں کی طرف پرواز کر گئی۔ امید واثق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابا جان کے حسن ظن کے عین مطابق ان سے اپنی بے پناہ رحمت کا معاملہ کیا ہوگا اور انبیاء، صدیقین اور شہداء کے زمرے میں انہیں شمولیت کا پروانہ جاری کیا ہوگا!!!

نحسبه كذلك ولا نزكي على الله أحدًا م اللہ کے مقابلے میں کسی کی پاکی بیان کرنیکی جرأت نہیں کرتے مگر ابا جان کی پوری زندگی کی گواہی ہمیں اسی حسن ظن کی امید دلا رہی ہے۔ (واللہ حسیبہ)

میرے میاں بتاتے ہیں غسل کے وقت جسم انتہائی نرم ملائم اور ہلکا تھا، شہادت کی انگلی بدستور بند مٹھی سے باہر کلمہ ءشہادت کا اقرار کر رہی تھی۔ جس کی اسی طرح تدفین کی گئی تغسیل وتکفین سے قبل ابا جان کو شفا انٹرنیشنل ہاسپٹل سے جس سفید چادر میں لپیٹ کر لایا گیا تھا۔ اسے الگ کیا گیا تو انگلی سے رستا ہوا خون سفید کپڑے پر لگا ہوا تھا جو وفات کے بعد بہا تھا۔

☆.....☆.....☆

آسیہ راشد

اِک ستم اور مری جاں!

2002ء میں لکھی گئی یہ تحریر پاکستان کی بدترین صورت حال کی عکاسی کر رہی ہے۔ آج کل کے حالات سے اس کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حالات بہتر ہونے کی بجائے بد سے بدتر ہو چکے ہیں آخر ان سب کا ذمہ دار کون ہے؟ ذرا سوچیے .....

جب سے ہم نے وزیر موصوف پٹرولیم کا یہ بیان پڑھا ہے کہ گیس 8 سے 20% تک مہنگی کر دی گئی ہے تو یقین جانئے ہمارے پاؤں خوشی سے زمین پر نہیں ٹک رہے۔ کیونکہ عوام کے احتجاج پر انہوں نے کمال بے اعتنائی سے فرمایا ہے کہ اگر کوئی گیس کا بل نہیں دے سکتا تو وہ اسے استعمال نہ کرے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وزیر موصوف مشہور زمانہ انگریزی فلم ''بیک ٹو دا فیوچر'' سے خاصے متاثر ہیں اور اپنے عوام کو اس پرانے دور میں دھکیلنا چاہتے ہیں، جس دور میں ہمارے آباؤ اجداد رہا کرتے تھے۔ سائنس کی ترقی انہیں ایک آنکھ میں نہیں بھا رہی۔ ابھی بھی ہمارے ملک کی بے شمار آبادی دور جدید کی سہولیات کے بغیر زندگی گزار رہی ہے اور وزیر موصوف شاید یہ چاہتے ہیں کہ تمام ملک کے عوام (خواص نہیں) یکساں طرز زندگی گزاریں۔ ایک طرف ہمارے وزیر ٹیکنالوجی ہماری قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے پر مصر ہیں اور دوسری طرف ایسے وزراء ہمیں لکڑیوں اور پتھر کے دور میں لے جانا چاہتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کون کامیاب ہوتا ہے اپنے موجودہ حالات پر نظر ثانی کے بعد ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم یہ بل ادا نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اب پرانے دور کی یادیں تازہ کرتے کرتے ہم بذات خود اس دور میں قدم رنجہ فرمانے والے ہیں کیونکہ جب ہم بل ادا نہیں کر پائیں گے تو ہمارا گیس کا کنکشن کاٹ دیا جائے گا اور ہم اپنے اودن ہیٹر اور گیزر کو اونے پونے داموں بیچ دیں گے اور بازار جا کر مٹی کے تیل کا چولہا ڈھونڈ کر لائیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم وہ بھی نہ خریدیں کیونکہ اس سے جان کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ پھر ہم دوسرا راستہ اختیار کریں گے یعنی مٹی اور اینٹوں کا چولہا بنوائیں گے، اس میں لکڑیاں اور اُپلے ڈال کر آگ جلانے کی کوشش کریں گے کیونکہ ہم نے اپنی ماؤں کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔ پھر پھنکنی کی مدد سے آگ کو تیز کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس کوشش میں ہماری آنکھیں اشکبار اور لہولہان بھی ہوسکتی ہیں۔ یوں بھی یوٹیلٹی بل آنے کے دنوں میں ہماری آنکھیں پہلے بھی کئی بار اشکباری کے مظاہرے کر چکی ہیں، اب لہولہان ہونے کی باری ہے۔ خیر اس چولھے پر کئی گھنٹوں کی تیاری کے بعد جب ایک سالن پکے گا اور بچے ہم سے دوسرے سالن کی فرمائش کریں گے تو ہم انہیں اپنی لال لال آنکھیں دکھا کر خاموش کروا دیں گے۔ اس طرح بچوں کی بگڑی عادات اور روزانہ کے نخرے بھی ختم ہو جائیں گے۔ جب کھانا سادہ ہوگا تو صحت بھی اچھی ہوگی، دہی اور اچار چٹنی سے کھانے کا رواج دوبارہ چل پڑے گا اور اخراجات میں بھی لامحالہ کمی واقع ہو جائے گی۔

جیسا کہ وزیر موصوف نے ہمارے صدر صاحب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے یہ بیان دیا ہے جو انہوں نے ٹی وی پروگراموں کی حد سے بڑھتی ہوئی آزادی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''اگر کسی کو ٹی وی پروگرام پسند نہیں ہیں تو وہ ٹی وی بند کر دے۔ اب یہ دوسرا بیان آیا ہے کہ اگر کوئی بل نہیں دے سکتا تو وہ گیس استعمال نہ کرے۔

یہ حکم دیگر سہولیات پر بھی لاگو ہوسکتا ہے۔ اب ہم اس دن کے منتظر ہیں جب ٹیلی فون اور پانی کے وزیر بھی کچھ ایسے ہی آرڈر جاری کریں گے کہ اگر آپ بل نہیں دے سکتے تو اسے استعمال نہ کریں۔

ہم چشم تصور سے وہ دن دیکھ رہے ہیں جب ہمارا بجلی کا کنکشن

کاٹ دیا جائے گا اور ہم بجلی کی مرہون منت تمام اشیاء کی سیل لگا دیں گے، مثلاً ٹی وی، فرج کمپیوٹر، پنکھے کولر، اے سی، واشنگ مشین وغیرہ کو اونے پونے داموں بیچ کر ہر کمرے کیلئے کینڈل لائٹس خرید لیں گے جو ہمارے گھر کو روشنی بخشنے میں ہمارا ساتھ دیں گی۔ رات کو گھر کے چھوٹے سے صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کیا جائے گا۔ چارپائیاں خریدی جائیں گی چارپائیوں پر سفید چاندنیاں اور ان پر سفید مہر عجب بہار دکھائیں گی۔ وہ فرصت کے رات دن دوبارہ لوٹ آئیں گے جن کو ہم اکثر یاد کیا کرتے تھے کیونکہ ہمارے وقت کا دشمن ٹی وی تو بند ہو چکا ہوگا جو ہمیں رات دو بجے تک جگایا کرتا ہے اور ہمارے بچے انٹرنیٹ کی خرافات یعنی چیٹنگ اور بے پردہ بیبیوں کو دیکھنے سے محفوظ ہو جائیں گے سرِ شام سو جانا اور علی الصبح اٹھ جانا ایک انوکھا تجربہ ہوگا جو ہمیں فطرت کے قریب لے جانے میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔

گھڑے کا ٹھنڈا میٹھا پانی اور تازہ خوراک ہماری صحت کیلئے بہت اچھی ثابت ہوگی۔ ہماری صحت کو خراب کرنے میں ٹیلی فون کا بھی بہت عمل دخل ہے۔ اس ایجاد نے اپنوں میں قربت کی بجائے فاصلے بڑھا دیئے ہیں۔ ہم فون پر حال احوال پوچھ کر اپنا فرض پورا کر لیتے ہیں۔ جب فون کٹ جائے گا یعنی بل ادا نہ کر سکنے پر ایسا تو ہوگا تو ہم اپنے عزیز رشتہ داروں سے ملنے خود جایا کریں گے جس سے پیار محبت میں اضافہ ہو گا۔ یوں ایک تیر میں کئی شکار کریں گے۔ ایک تو عزیز کا حال احوال پوچھ لیا دوسرے اس کے پنکھے اور اے سی کی ٹھنڈی ہوا کے مزے لئے، تھوڑا بہت ٹی وی سے بھی لطف اندوز ہوئے اور تیسرے آب و ہوا کی تبدیلی کے فائدے بھی تو بہت ہیں۔ جس سے ہماری صحت اچھی ہو سکتی ہے۔ ہمارا دل پہلے ہی بہت ناتواں ہے اتنے زیادہ ریٹ کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس دل کی صحت کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔

پانی کا نل کٹوانے کی صورت میں ہم نے ابھی پلان نہیں کیا کیونکہ راوی ہمارے گھر سے کافی دور ہے۔ راوی کے نزدیک رہنے والے اس سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں مگر ہمیں شاید ہینڈ پمپ لگوانا پڑے گا۔

ان بلوں سے بچت کی صورت میں ہم بہت سی ادھوری خواہشات پوری کر سکتے ہیں جن کے ہم ابھی تک صرف خواب ہی دیکھتے رہے مثلاً:

ہم اپنے بچوں کو کبھی کبھار تفریح کیلئے کہیں باہر لے جا سکتے ہیں۔

اپنے کسی ایک بچے کو کسی اچھے سکول یا کالج میں داخل کروا سکتے ہیں۔

وہ نگینے والی چوڑیاں خرید سکتے ہیں جن کو ہم پچھلے کئی برسوں سے جیولر کی دکان پر دیکھ رہے ہیں یا ان رقوم کو جوڑ کر ہم موٹر سائیکل یا چھوٹی موٹی گاڑی خرید سکتے ہیں۔

یا پھر اپنی بچی کی شادی کیلئے قرض لینے سے بچ سکتے ہیں۔

یا کچھ سالوں تک حج کی سعادت سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں اور کچھ نہ ہوا تو اس رقم سے ہمارے بچے ہمارے مرنے پر اُٹھنے والے اخراجات تو بآسانی پورے کر ہی سکتے ہیں۔

اس کے باوجود اگر ہماری ان عیاشیوں پر ہمارے کسی وزیر یا تدبیر کی نگاہ پڑ گئی تو ہو سکتا ہے کہ وہ ہم پر کوئی نیا ٹیکس لگا دیں۔ ہم اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

اِک ستم اور مری جاں ابھی جاں باقی ہے!

☆.....☆.....☆

محمد صفدر بشیر

وہ تین دن

۲۱، ۲۲ اور ۲۳ نومبر ۲۰۱۴ء میری طرح بہت سوں کی زندگی کے یادگار دن تھے۔

ان تین یادگار دنوں کے لیے جماعت اسلامی پاکستان نے نئے امیر جماعت جناب سراج الحق صاحب کی زیر قیادت اجتماعِ عام کے عنوان سے ایک خیمہ بستی بسانے کا اہتمام کیا۔

یہ پروقار و پرشکوہ بستی مینارِ پاکستان کے سائے تلے اس سے ملحقہ سرسبز و شاداب روشوں اور وسیع و عریض رقبہ پر (جو ماضی میں منٹو پارک کہلاتا تھا) بسائی گئی تھی۔

وطن عزیز میں بڑھتی ہوئی بجلی و گیس کی لوڈ شیڈنگ کے باعث انڈسٹری اور تجارت تباہ ہو چکی ہیں۔ چنانچہ کنٹینرز جو کبھی مالِ تجارت اور صنعت و حرفت کی نقل و حمل کے لیے استعمال ہوا کرتے تھے اب مظاہرین کے راستے روکنے اور احتجاجی جلسہ و جلوس کی رونق دوبالا کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

جماعت اسلامی نے بھی پروفیشنل انداز میں ان کنٹینرز کا استعمال کر کے لمبی چوڑی دو منزلہ اسٹیج بنائی۔ جس کی پہلی منزل پر چنیدہ مہمانانِ گرامی آرام دہ کرسیوں پر تشریف فرما تھے اور دوسری منزل پر اکابرین و مقررین جماعت تشریف رکھتے تھے۔ اس لمبی چوڑی خوبصورت اور مضبوط اسٹیج کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس اجتماع کو کامیاب بنانے کے لیے بھرپور تیاریاں کی گئی ہیں۔ اسٹیج کی پشت پر اتنا ہی طویل و عریض خوشرنگ و خوشخط ''اسلامی پاکستان ..... خوشحال پاکستان'' لکھا ہوا بینر نہایت بھلا لگتا تھا۔ اس اجتماع عام کا پس منظر کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ یہ اجتماع عام مہنگائی، بے یقینی، بد اعتمادی اور ملک میں افراتفری طبقہ اشرافیہ (کہ جس میں شرافت نام کو بھی نہیں) کی لوٹ کھسوٹ، طفل تسلیوں، بڑھتے ہوئے اسٹریٹ کرائمز، حکومت کی زیر سرپرستی بڑھتی ہوئی عریانی و فحاشی کی فضا میں منعقد کیا جا رہا تھا۔

بلاشبہ اس اجتماع عام کا مقصد یہ بھی تھا کہ عوام الناس کو جھنجھوڑا جائے انھیں خواب غفلت سے جگایا جائے اور سمجھایا جائے کہ مٹھی بھر مراعات یافتہ طبقہ ان کی گردنوں پر پیر تسمہ پا کی طرح سوار ہے۔ ہمارے با صلاحیت نوجوانوں کی زندگیاں بے مقصد گزر رہی ہیں۔ انھیں بے مقصد نعروں کے سحر سے نکال کر اللہ کے دین کو غالب کرنے کی کوششوں میں اپنے ساتھ شامل کیا جائے۔ بحیثیت مسلمان ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سربراہی میں قائم ہونے والی اسلامی فلاحی ریاست کو ایسی وسعت حاصل ہوئی کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب کے دور حکومت میں اسلامی ریاست کا رقبہ کم و بیش ۲۲ لاکھ مربع میل تھا جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ہمارا دین اور سیاست ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ہمارے دین میں سیاست ہے مگر سیاست میں دین نہیں۔ بدقسمتی سے کچھ مفاد پرستوں نے سیاست میں دین کو شامل کر لیا ہے۔ اگر دین اور سیاست ساتھ ساتھ چلیں تو یہ مخلوق خدا کے لیے سراسر رحمت ہے۔

ہمارے با صلاحیت نوجوانوں کی صلاحیتوں سے غیر ممالک تو بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں مگر اپنے ملک میں جی بھر کر ان کی تذلیل کی جاتی ہے۔ گھنٹوں قطار میں کھڑے رہنے کے بعد بھی انھیں ملازمت نہیں ملتی اور انھیں سرخ جھنڈی دکھا دی جاتی ہے چونکہ اس آسامی پر تقرر سفارش یا رشوت کی وجہ سے پہلے ہی سے ہو چکا ہوتا ہے۔ اخبارات میں اشتہارات دے کر نوجوانوں کو بلا کر اور گھنٹوں قطار میں کھڑا کر کے ان کی تذلیل کرنا تو محض رسماً ضابطے کی کارروائی کے طور پر ہوتا ہے۔ سرکاری ملازمین عوام کو غلام اور اپنے تئیں حکمران سمجھتے ہیں۔

عام لوگوں کے لیے رزق حلال کمانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو گیا ہے۔ آئے دن اخبارات میں معصوم بچوں کے ساتھ ماؤں کی

خودکشیوں کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں جو بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں کا منظر دیکھنے کی تاب نہ لا کر حرام موت مرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ بھوک، مفلسی اور خودغرضی نے معاشرے کا اجتماعی ضمیر مردہ کر کے رکھ دیا ہے حکمران طبقہ اس قدر بے حس ہو چکا ہے کہ قحط زدہ علاقوں میں محض ایک دورہ کرنے اور میڈیا، میں اپنی تصویریں نشر کروانے کے لیے لاکھوں روپے خرچ کر دیتا ہے اور بے شرمی و بے حسی کی انتہا یہ ہے کہ ان بھوکے ننگے لوگوں کے درمیان بیٹھ کر بڑی ڈھٹائی کے ساتھ مہنگے سے مہنگے مرغوب کھانے کھا کر حق حاکمیت ادا کر دیتا ہے۔ اگر وہ اپنے پروٹوکول اور کھانے پر اٹھنے والے اخراجات ہی قحط زدہ لوگوں پر خرچ کر دیتے تو بہت سوں کا پیٹ بھر سکتا تھا۔ معاشرے کا باشعور اور سنجیدہ طبقہ دھرنوں کی بے معنی سیاست اور مقررین کے غیر متوقع اندازِ تخاطب کے بازاری پن سے تنگ آ چکا تھا اور یہ سمجھنے لگا تھا کہ شرافت رخصت ہوئی سیاست کے گھر سے ..... ! اس کے علاوہ دھرنوں کے حوالے سے کچھ ''سینہ گزٹ'' کچھ غیر مصدقہ کہانیاں باوثوق ذرائع کے سے انداز میں سرگوشیوں میں گردش کرنے لگیں تو شیخ ورند کی باتوں پر سے ایک عامی کا اعتماد بھی اٹھنے لگا۔ دھرنوں کے اعتماد کا مینار بھی زمین بوس ہونے لگا۔

ملک کی نام نہاد اکثریتی پارٹیوں کی درون خانہ ملی بھگت سے بھی عوام آگاہ ہوتی جا رہی تھی۔ ایک چہرے کے پیچھے چھپا دوسرا چہرہ بھی نظر آنے لگا تھا۔ ایک ہی سوراخ سے بار بار ڈسے جانے کا تجربہ بھی عوام کو ہو چکا تھا۔ اور اب دھرنوں کی سیاست بھی آہستہ آہستہ بے نقاب ہوتی جا رہی تھی۔ عوام حیران و پریشان تھے کہ مخلص و غمگسار ان کے دکھوں کا مداوا کرنے والا کوئی بھی تو نظر نہیں آ رہا تھا۔

عوام ''جائیں تو جائیں کہاں'' والی کیفیت میں مبتلا تھے کہ ایسے میں جماعت اسلامی نے ''اسلامی پاکستان .....خوشحال پاکستان'' کے نعرہ اور موٹو کے ساتھ، دل سوزی کے جذبہ کے ساتھ، محبت و خلوص کے ساتھ اپنے اجتماع عام ۲۰۱۴ء میں شرکت کی دعوت دی۔

تپتے صحرا میں یہ آواز ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی۔

بادِ سموم کی بجائے بادِ نسیم.....!!

الیکشنوں میں دھن، دھونس اور دھاندلی سے کام لے کر زیادہ ووٹ حاصل کرنے والی سیاسی پارٹیاں اگلے الیکشنوں تک اکثریتی پارٹی ہونے کا ڈھول پیٹتی رہتی ہیں اور دوسری سیاسی پارٹیاں اس ڈھول کا پول کھولنے میں اپنی تمام تر توانائیاں صرف کرتی نظر آتی ہیں۔

ایک اللہ پر ایمان رکھنے والوں کے لیے، مسلمان کہلانے والوں کے لیے اکثریت اور اقلیت تو کبھی مسئلہ رہی ہی نہیں۔ اگر یہ اتنا ہی اہم مسئلہ ہوتا تو پھر سیدنا نوح علیہ السلام تو سب سے زیادہ ناکام اللہ کے بندے ٹھہرائے جاتے کہ کم و بیش ساڑھے نو صدیوں کی محنت شاقہ کے بعد ان کی پارٹی میں معدودے چند لوگ ہی تھے۔

مسئلہ دراصل اکثریت و اقلیت کا نہیں بلکہ معروف اور منکرات کا ہے.....اچھائی اور برائی کا ہے۔

جہاں دیگر پارٹیوں کے پروگرامات کا آغاز ناؤ نوش، پھبتیاں کسنے، فقرے چست کرنے سے ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ تقریر کی تیاری میں محض حلق تر کرنے کا اہتمام ہی نہیں کیا گیا بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھ کر تیاری کی گئی ہے۔ وہاں جماعت کے کسی بھی پروگرام کا آغاز درسِ قرآن و حدیث سے ہوتا ہے۔

اجتماع عام میں ہی محترم حافظ محمد ادریس صاحب نائب امیر جماعت اسلامی نے اپنے درسِ قرآن میں بڑی پیاری بات کہی کہ اگر چھت صاف ستھری ہو تو پرنالے سے پانی بھی صاف ہی گرے گا۔ لیکن اگر چھت غلاظت سے بھری ہو تو پرنالے سے صاف ستھرے پانی کے گرنے کی خواہش عبث ہے۔

اے کاش کہ یہ بات ہر کس و ناکس کی سمجھ میں آ جائے کہ ہماری سیاست کی چھت غلاظت کا ڈھیر بن چکی ہے۔ اس کے پرنالوں سے گند ہی گند، تعفن ہی تعفن اور بدبودار پانی بہہ رہا ہے۔ بہتر رہے گا جب تک کہ اسے صدق دلی کے ساتھ صاف نہ کیا جائے۔

بات وہی اکثریت یا اقلیت کی نہیں بلکہ حق و باطل کا ساتھ دینے کی ہے۔ اچھائی یا برائی کو پسند کرنے کی ہے۔

اس مہم کے دوران مجھے کچھ تجربات ہوئے جو ایک طویل عرصہ

ملک سے باہر رہنے کی بنا پر میرے لیے باعث حیرت تھے۔ مثلاً ایک نشست میں جب میں نے جماعت کے امیدوار کو ووٹ دینے کی بات کی تو ایک صاحب نے صاف صاف لفظوں میں فرمایا کہ وہ کسی ''جماعتیے'' کو کبھی بھی ووٹ نہیں دیں گے۔ میرے استفسار پر وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ فلاں موقع پر ان کا بھتیجا جوا کھیلتے کھلاتے ہوئے پکڑا گیا تو ان کے علاقے سے جماعت کے امیدوار نے تھانہ جا کر اسے چھڑایا نہیں اور پھر چند ماہ بعد وہی نوجوان کسی لڑکی کے اغوا کے کیس میں دھر لیا گیا تو بھی اس امیدوار نے برائی کے ہاتھ مضبوط کرنے سے انکار کر دیا اور تھانہ جا کر اس کو چھڑوانے کی بات نہیں کی۔ مجھے تو ''جماعتیے'' کے اس کردار پر فخر ہے۔ الحمدللہ۔

چلتے چلتے ان بزرگوار کا یہ جملہ بھی سن لیجیے جو مجھے آج بھی یاد ہے۔

''انہاں دیاں نمازاں تے روزیاں تے دوجے نیکی دے کماں نوں اسیں پھائے لانا اے جے اوساڈھے منڈے نوں نئیں چھڑا سکے تے.....''

(ان صاحب کی نماز اور روزوں کے اہتمام اور خدمت خلق کے کام کا ہمیں کیا فائدہ اگر وہ ہمارے نوجوان کو ہی نہ چھڑوا سکے تو)

قوم کی اخلاقی حالت پر غور کیجیے..... ہم جیسے اگلے وقت کے لوگوں کا سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے کہ جو بات کبھی کرنے، سننے اور لکھنے میں ندامت محسوس کی جاتی تھی۔ آج وہ بات بھری محفل میں بلا جھجک سینہ ٹھونک کر کہی جاتی ہے۔

اخلاقی طور پر قوم کی اس تباہ حالی کا اگر نظر عمیق سے جائزہ لیا جائے تو یہ بات بھی کھل کر سامنے آتی ہے کہ ہماری چھت ہی غلاظت سے بھری ہوئی ہے۔

المیہ یہ ہے کہ من حیث القوم ہم اس چھت کی غلاظت میں اضافہ کرنے کو پسند کرتے ہیں اور عملاً اس غلاظت میں اضافہ کرتے بھی ہیں۔ اس غلاظت کو صاف کرنے اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

غلاظت کے اس ڈھیر میں علاوہ دیگر عوامل کے اضافہ کا ایک سبب بلکہ سب سے بڑا سبب میڈیا بھی ہے۔

کیا میڈیا جماعت کے معیار و کردار سے واقف نہیں؟

ارکان جماعت ہی نہیں وابستگانِ جماعت تک کے معاملات، ایثار، رکھ رکھاؤ اور اندازِ گفتگو انھیں عام لوگوں سے ممتاز کرتا ہے۔ میڈیا بے ہنگم قسم کی دھما چوکڑی اور تقاریر کے نام پر دشنام طرازی تو مسلسل کئی کئی گھنٹے ٹی وی پر دکھاتا ہے مگر جماعت کے اس عظیم الشان اجتماع کی چند منٹ کے لیے چند جھلکیاں ہی دکھا سکا۔

لوگوں کو جماعت سے دور رکھنے میں میڈیا کا یہ کردار کچھ نیا نہیں ہے۔ پاکستان میں الیکٹرونک میڈیا کے متعارف ہونے سے پہلے پرنٹ میڈیا کے دور میں بھی یہی کردار تھا۔ اس دور میں لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات ڈالی جاتی تھی کہ جماعت کی رکنیت کا معیار انتہائی کڑا اور سخت ہے۔ اس طرح عوام الناس جماعت کے قریب آنے سے گھبراتے تھے۔ حالانکہ جماعت اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتی جو اسلام ایک مسلمان سے کم سے کم افعال کا مطالبہ کرتا ہے۔ میڈیا نے اسلامی تعزیراتی سزاؤں کا اک خوف مسلط کر رکھا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ''بزرگانِ میڈیا'' اس حقیقت سے نابلد نہیں ہوں گے کہ جماعت اسلامی کے کچھ افراد اہم حکومتی مناصب پر مختلف ادوار میں تعینات رہے (جس کی تفصیل بہن کلثوم رانجھا کے کتابچہ بعنوان ''جب جب ہمیں اقتدار ملا'' میں دیکھی جا سکتی ہے) مگر کسی ایک پر بھی پلاٹ، پرمٹ یا قرضہ کے حصول یا کسی اور نوعیت کی بدعنوانی کا الزام نہیں لگا..... لوگ آج بھی اڑھائی مرلہ کے مکان میں رہنے والے قلندر صفت عبدالستار افغانیؒ کو یاد کرتے ہیں۔ کراچی میں ٹریفک کا مسئلہ حل کرنے کے لیے اوور ہیڈ پلوں کی داغ بیل ڈالنے والے محترم نعمت اللہ خان صاحب آج بھی لوگوں کے دلوں میں بستے ہیں جو سرکاری کھانا کھانے کی بجائے تمام اسٹاف کے لیے گھر سے کھانا منگوا کر کھاتے تھے جو تھر کے سپاہیوں کے لیے کنویں کھدوانے کے لیے تھر کے تپتے ریگستان میں بہ نفس نفیس پہنچ جانے میں عار محسوس نہیں کرتے تھے۔

کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ سمندر پار سے کمرے میں بیٹھ کر کی جانے والی تقاریر تو چلتے ہوئے پروگرام روک کر ٹی وی پر ''بریکنگ نیوز'' کے عنوان سے ٹھونسی جاتی ہیں مگر جماعت اسلامی کے بڑے سے بڑے کام کو عوام تک پہنچانے کے لیے میڈیا کے پاس وقت و وسائل نہیں ہوتے حتیٰ کہ آفاتِ سماوی (مثلاً زلزلہ، سیلاب) کے موقع پر بھی جماعت کے ہزاروں بے لوث رضا کاروں کی خدمات بھی میڈیا کو نظر نہیں آتیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ سب کچھ میڈیا کو بھی نظر آ جائے۔ اور اس کے کرتا دھرتا اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہوئے اسے عوام تک پہنچائیں تو لوگ معاشرے میں اچھوں اور اچھائی کو پسند کرنے لگیں گے اور برائی سے اجتناب کرنے کی کوشش کریں گے اور یہ سب کچھ سیکولر طبقہ کو کسی صورت بھی منظور نہیں کہ ہمارے ملک کی چھت صاف ستھری ہو جائے۔

اس تین روزہ اجتماع عام کا شائع شدہ پروگرام وسیع پیمانے پر تقسیم کیا گیا تھا۔ اس پروگرام کو دیکھ کر ہی تاڑنے والے جماعت کی صلاحیتوں کو تاڑ گئے ..... پروگرام نہایت عرق ریزی سے تیار کیا گیا تھا۔ بچوں سے لے کر سینئر سٹیزن تک کے مرد و خواتین کے ذوق کے مطابق پروگرام ترتیب دیے گئے اور ہر پروگرام میں ایک مثبت پیغام تھا۔

ایک صاحب نے پروگرام کے یوتھ سیشن پر نظر دوڑاتے ہوئے فرمایا کہ یہ اچھی بات ہے کہ جماعت پی ٹی آئی کی طرح ''یوتھ'' کو استعمال کرنے کا ارادہ رکھتی ہے..... میں نے انھیں کہا۔

''سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے اپنے جملے میں لفظ ''استعمال'' کو جس طرح استعمال کیا ہے۔ وہ مجھے اچھا نہیں لگا اور دوسری بات یہ ہے کہ جماعت تو شروع ہی سے نوجوانوں کو بے راہ روی سے بچانے کے لیے ان کی تربیت کر رہی ہے۔ آج جو جماعت کے صف اول کے قائدین ہیں وہ سب کے سب اسلامی جمعیت طلبہ سے ہی آئے ہیں۔'' وہ فوراً حیرت زدہ ہوتے ہوئے قائل ہو گئے۔

اجتماع عام کے اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جماعت کے نظم خواتین نے بھی ''بدلتی دنیا میں عورت کا کردار'' کے موضوع پر بین الاقوامی کانفرنس کر ڈالی جس میں مختلف ممالک کی مندوبین خواتین نے شرکت کر کے اس کانفرنس کو خوب کامیاب بنایا۔

خواتین کا باپردہ پنڈال اور رہائش گاہیں مردوں سے الگ تھلگ بنائی گئی تھیں۔ ٹی وی پر حالیہ دھرنوں کے نام پر میک اپ زدہ بے پردہ خواتین کے مناظر دیکھنے کے عادی شرکاء کے لیے یہ باپردہ انتظام باعث حیرت تھا۔ خواتین شرکاء کی تعداد توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ لہٰذا فوری طور پر مزید خیمہ جات کا انتظام مینار پاکستان کی روشوں پر کیا گیا۔

جماعت کے مخالفین بھی جماعت کے نظم و ضبط کے قائل ہیں۔ نظم خواتین نے کچھ بچیوں کی ڈیوٹی لگائی تھی جو رضا کارانہ طور پر ہاتھوں میں شاپرز لیے پنڈال میں گھومتی پھرتی رہیں اور بچوں کے پھینکے ہوئے ریپرز اور چپس کے خالی پیکٹس وغیرہ اٹھا اٹھا کر شاپرز میں ڈالتی رہتیں۔ اس طرح پنڈال میں کہیں بھی کوڑا کرکٹ دیکھنے کو نہ ملا۔ اس حکمت عملی سے اجتماع عام میں اول مرتبہ شریک ہونے والی خواتین بے حد متاثر ہوئیں۔

مجموعی طور پر شرکاء اجتماع کی تعداد توقعات سے کہیں زیادہ ہو گئی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اچانک اس قدر زیادہ افراد کی آمد منتظمین کے کیے گئے انتظامات کو ناکام بنا دے گی۔ اور بقول شخصے جماعت کا یہ ''شو'' فلاپ ہو جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ جماعت کی یہ کوشش توقع سے کہیں زیادہ کامیاب ہوئی۔

ارکان نے ایثار میں انصارِ مدینہ کی یاد تازہ کر دی۔ قریبی شہروں اور نواحی علاقوں سے آئے ہوئے ارکان راتوں کو سونے کے لیے اپنے اپنے گھروں میں چلے جاتے اور پھر صبح دم پروگرام میں شرکت کے لیے واپس آ جاتے۔ اسی طرح جو ارکان دور دراز کے شہروں سے آئے تھے وہ اپنی رہائش گاہ مہمانوں کے آرام کے لیے خالی کر کے خود خیموں کی طنابوں میں بستر لگا لیتے۔

مہمانانِ اجتماع عام کو بجا طور پر حیرت تھی کہ یہاں کھانے پر ٹوٹ پڑنے کی روایت ٹوٹ گئی۔ ٹی وی پر اکثر سیاسی پارٹیوں کے کھانے پر ٹوٹ پڑنے کے مناظر دیکھے تھے کہ جنھیں دیکھ کر سر شرم سے

جھک جاتے تھے۔اس اجتماع عام میں ایسا کوئی منظر دیکھنے کو نہیں ملا۔ ارکان کھانا خود کھانے کی بجائے دوسروں کو پہلے کھلانے کی کوشش کرتے۔ بلکہ اصرار کے ساتھ پہلے انھیں کھلاتے۔

ایسا لگتا تھا کہ یہ لوگ جینے کے لیے کھاتے ہیں، کھانے کے لیے نہیں جیتے۔شرکاء نے خوش دلی سے دال کو حلیم کا نام دیا اور نمکین اور میٹھے ملے جلے چاولوں کو بریانی و تنجن جانا اور خدا لگتی بات تو یہ ہے کہ خلوص ومحبت کی اس فضا میں یہ کھانا فائیو سٹار ہوٹل کے کھانے سے کہیں زیادہ مزیدار لگا۔

کسی نے کھانے میں کوئی نقص نکالا نہ ناظم مطبخ سے کسی قسم کا گلہ کیا بلکہ اس کی تعریف ہی کی کہ انھوں نے غیر متوقع طور پر حاضری بڑھ جانے کے باوجود کسی کو کھانے میں کمی کا احساس تک نہیں ہونے دیا۔

یہ حقیقت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ پاکستان میں دیگر پارٹیاں جو اپنے اندر الیکشن کروانے کا ڈھنڈورا پیٹتی نظر آتی ہیں ان میں بھی نامزدگیاں ہی ہوتی ہیں۔ان کا جمہوری انداز سب کے سامنے ہے۔ان میں بھائی، بھتیجے، بیٹے، بیٹی، داماد اور سمدھی وغیرہ ہی پارٹی کے تمام ارکان میں سب سے زیادہ ٹیلنٹڈ ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس جماعت میں روزِ اول ہی سے خالصتاً جمہوری انداز میں باقاعدگی سے الیکشن ہوتے ہیں۔ جماعت کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اس پر کسی شخص یا خاندان کی اجارہ داری نہیں ہے۔

جماعت کی یہ روایت اسے دوسری پارٹیوں سے ممتاز کرتی ہے کہ اس میں منصب کو ذمہ داری سمجھا جاتا ہے اور از خود ذمہ داری کے حصول کے لیے کوئی بھی خواہش و کوشش نہیں کرتا لیکن نظم اگر ذمہ داری سونپ دے تو پھر اس ذمہ داری کو احسن طور پر نبھانے کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتیں کھپا دیتا ہے۔

اس حقیقت سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا کہ جماعت اسلامی نے پاکستان کو متحد رکھنے کے لیے بے بہا قربانیاں دی ہیں اور آج بھی اس کے ضعیف رہنماؤں کو دھڑا دھڑ پھانسیاں دی جا رہی ہیں جبکہ عالمی ضمیر سویا ہی نہیں ہوا بلکہ مر چکا ہے۔

جماعت اسلامی ایک کردار ساز جماعت ہے۔آج کے مادی دور میں جہاں ہر سو دھوکہ دہی، کرپشن اور اخلاقی گراوٹ کا دور دورہ ہے یہ کام کچھ آسان کام نہیں۔ اس کے لیے سخت محنت ، مشقت اور صبر واستقامت کی ضرورت ہے۔ہم اللہ سے دعا گو ہیں کہ وہ ہمیں ہمت دے اور ان صفات سے متصف فرمائے۔آمین

☆.....☆.....☆

محشرِ خیال

غزالہ ارشد۔ کراچی

دسمبر کے شمارے میں شامل محترمہ آسیہ راشد صاحبہ کا تحقیقی مقالہ قائداعظم کی زندگی کا دینی اور روحانی پہلو بہت فکر انگیز اور دلچسپ انداز تحریر کا عکاس ہے۔ ایسی تحریروں کی بہت ضرورت ہے تا کہ قائد کی صحیح شخصیت کو واضح کیا جا سکے۔ مجھے اس میں شامل بہت سے حوالے درکار تھے جو ایک ہی مضمون میں مل گئے۔ یہ آسانی مہیا کرنے کے لیے آپ کا بہت شکریہ۔ مجموعی طور پر آپ کا شمارہ دلچسپ تھا۔

☆.....☆.....☆

فرحت طاہر۔ کراچی (۱)

الحمدللہ! ماہ دسمبر کا بتول ۱۳ر دسمبر کو ہی مل گیا جبکہ نومبر کا بتول ۵ر دسمبر کو ہاتھ آیا تھا! اب ضروری ہو جاتا ہے کہ اس پر تبصرہ کیا جائے!

دسمبر کے مہینہ کے آغاز سے قبل ہی اس کی دھوم مچ جاتی ہے کہ دسمبر آ رہا ہے! اس کی وجہ محض عیسوی کیلنڈر کا آخری مہینہ ہونا نہیں بلکہ اس کے ساتھ جڑے تلخ و شیریں واقعات اور سانحات ہیں (اس تحریر کو فائنل کرتے ہوئے سانحہ پشاور بھی سامنے آ گیا ہے! اللہ رحم کرے!)

دسمبر کے بتول کی خاص بات اس کا اجتماع عام سے متصل ہونا ہے۔ گو کہ اس میں ایک ہی تحریر اس سے متعلقہ ہے! وجہ ظاہر ہے کہ بتول کی اشاعت اور اجتماع عام میں وقفہ نہیں تھا۔

دسمبر میں یوم قائد کے سلسلے میں آسیہ راشد کا خاص مضمون قائد اعظم کی زندگی کا دینی اور روحانی پہلو بڑا بروقت بھی تھا اور حقائق سے بھرپور بھی! سقوط ڈھاکہ کے عنوان سے کئی تحاریر ہیں۔ شاہدہ سحرؔ کی غزل کے علاوہ امّ ایمان اور شاہدہ اکرام کے افسانے اور نصرت یوسف کا نہاں خانہ دل! کچھ حوصلہ مند کچھ فکر انگیز سوچیں در آئیں!

نصرت یوسف کے نقشِ یقین اور فریدہ خالد کی ''یہ تو چلتی ہے...'' ایک ہی تھیم کے تحت ہیں یعنی تکلیف کے ساتھ آسانی ہے! رزق میں برکت اور معاشی خوشحالی کا ایک نسخہ قانتہ رابعہ نے دروازہ کھلا رکھنا کے مشورے کے ساتھ دیا ہے۔ فرحی نعیم نے ان خواتین کو، جو شوہروں کے ساتھ ایف بی آئی کے ایجنٹ کا سا سلوک کرتی ہیں انجام سے خبردار کیا ہے جبکہ شمیم فاطمہ نے مردوں کے کان کھینچے ہیں ذمہ داریوں سے پہلو تہی کرنے پر! عافیہ رحمت کا شکریہ اللہ میاں اور افشاں نوید کا تسبیح روز و شب کا دانہ دانہ رجوع الی اللہ کی طرف مدعو کرتے نظر آتے ہیں۔

ثناء علیم کا جشن بہاراں .... ہمارے روز و شب کی صحیح تصویر پیش کرتا ہے۔ گوشہ تسنیم میں ڈاکٹر بشریٰ نے علم اور معلومات کا کوزہ پیش کیا ہے مگر تشنگی یوں رہی کہ سقوط ڈھاکہ کے عنوان سے ان کی تحریر کی آنکھیں منتظر تھیں۔ ربیعہ ندرت کے ہلکے پھلکے نے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ ذو معنی تراکیب اور پر تبسم جملے! اجتماع عام میں ان سے ملاقات کی خوشی یاد کر کے دوہرا مزہ آیا!

خفتگان خاک میں پروفیسر غلام اعظم اور صغیرہ بانو شیریں کو یاد کیا گیا ہے۔ ان دونوں شخصیات پر مزید تحاریر کی ضرورت ہے! انتظار رہے گا!

اجتماع عام کے حوالے سے واحد تحریر سامیہ احسن کی ہے جس میں خواتین کانفرنس کا حال لکھا ہے۔ پروگرامز کی مزید تفصیلات اور تاثرات اگلے شماروں میں پڑھنے کو ملیں گے ان شاء اللہ! اجتماع عام میں شاہدہ اکرام، قانتہ رابعہ، آسیہ راشد اور نوشین جمیل سے مختصر مگر بڑی خوش کن ملاقاتیں رہیں۔ گو تشنگی رہی۔ جن سے ملاقات ہوئی اور نام نہ لیا ان سے معذرت! جن سے نہ مل سکے بڑا افسوس رہے گا!

ایک بات قابل ذکر ہے کہ جن کی تحاریر میگزین میں ہیں ان کے تبصرے بھی موجود ہیں! گویا ضرورت صرف قلم ہاتھ میں پکڑنے کی ہوتی

ہے جب اٹھالیا سو چل پڑتا ہے .....اللہ کرے ہمارے قلمکاروں کے خوبصورت قلم رواں رہیں اور ہمیں اچھی اچھی تحاریر پڑھنے کو ملتی رہیں ...اور ہاں اچھی خبر کہ امّ ایمان کے افسانوں کا مجموعہ صبح تمنّا شائع ہو گیا ہے۔جبکہ افشاں نوید کے کالمز کا مجموعہ نوید فکر بھی بالآخر آ گیا جس کا افتتاح اجتماع عام میں ہوا۔باذوق قارئین کو قلمی اور ادبی غذا مبارک ہو!

☆شکریہ فرحت!اس معذرت کے ساتھ کہ آپ کا یہ بروقت ملنے والا تبصرہ ایک ماہ کی تاخیر سے شامل ہو رہا ہے۔(مدیرہ)

فرحت طاہر۔کراچی (۲)

دعا اور امید ہے کہ ایمان اور صحت کی بہترین حالت میں ہوں!

بہت دفعہ رابطہ کرنے کا سوچا مگر کچھ کاہلی، کچھ آپ کی مصروفیات کا سوچ کر اور کچھ ذمہ داریوں میں اتنے گھرے کہ اپنی ذاتی تسکین کے لیے وقت نہیں نکال پائے!.....خواتین کانفرنس ماشاءاللہ بہت کامیاب رہی!مبارکباد قبول ہو!میں بھرپور طریقہ سے نہ اٹینڈ کر پائی۔کوشش ہے کہ ریکارڈنگ مکمل دیکھ سکوں!حریم ادب کی طرف سے ادارہ بتول کے لیے کتب اور کچھ مصنوعات آسیہ راشد کے ذریعے بھجوائی تھیں۔امید ہے کہ مل گئی ہوں گی۔اگر مزید چاہئیں تو ضرور مطلع کریں گی!آپ سے ملاقات نہ ہو سکی تھی مگر ثریا اسماء، آسیہ راشد، قانتہ، شاہدہ اکرام، ربیعہ ندرت، نوشین جمیل اور دیگر سے ہوئی۔مزید سے ملنے کی حسرت رہی۔

جنوری کا بتول اجتماع عام کے حوالے سے بڑے اشتیاق سے کھولا۔قانتہ رابعہ کے دونوں تبصرے (ادبی گوشہ + نوید فکر) اسی حوالے سے تھے۔بہ الفاظ دیگر فرحت نامہ لگے!خاص طور پر ادبی نشست کے تبصرہ کا ابتدائیہ پڑھ کر آنکھیں ملیں اور سانس لے کر یقین کیا کہ ہم زندہ ہیں بقول مستنصر حسین تارڑ، اپنی تعریف سن کر رپڑھ کر گمان ہوتا ہے کہ مر چکے ہیں کیونکہ لوگ صرف اسی موقع پر ہی آپ کی صلاحیتوں اور خوبیوں کا اعتراف کرتے ہیں ۔گویا بحیثیت قوم ہم مردہ پرست ہیں....مر کے جو ہر آپ کے جوہر کھلے!والا معاملہ ہوتا ہے!خیر تعریف نہ کرنے کا اپنا جواز ہوتا ہے کہ ایسا کرنے پر وعید سنائی گئی ہے۔لیکن حوصلہ افزائی اور خوشامد میں فرق کرنے کی ضرورت ہے!بظاہر ایک نظر آنے والے فعل کے انداز اور اثرات واضح طور پر مختلف ہوتے ہیں۔اور ویسے بھی فرد تنہا کچھ نہیں ہوتا دراصل اجتماعیت اسے اعتماد اور مضبوطی عطا کرتی ہے۔کسی ایک کی حوصلہ افزائی دیگر افراد کے جذبات کو بھی مہمیز کرنے کا باعث بنتی ہے۔امید ہے کہ ایسا ہی ہوگا!وریہ گواہیاں ہمارے حق میں حجت بنیں گی ان شاءاللہ!

یقین کریں.....ہم نے قانتہ کو ہرگز کوئی تحفے تحائف نہیں دیے تھے اس رطب اللسانی کے لیے!(قانتہ کی تحریر کردہ قیمتی کتب کا تحفہ ہمارے لیے کسی خزانہ سے کم نہیں!)لیکن دراصل وہ ان تمام کوششوں کی گواہ ہیں جو کنونشن کے انعقاد کے لیے کی گئی تھیں۔اجتماع عام کی نگران کو اتنی دفعہ فون کیا تھا کہ ہمیں اس وقت وہ نمبر زبانی یاد ہو گیا تھا!جگہ، وقت اور اسٹیج کی فراہمی کے لیے!ان کا افسوس بھرا لہجہ آج بھی سماعت میں محفوظ ہے جو ہماری طلب کی عدم دستیابی پر ان کی آواز میں در آیا تھا۔اللہ ان کی کوششوں کو جزائے خیر دے۔

قانتہ کے جذبات کی قدر دانی ہے!وہ تو کسی سنجیدہ موضوع پر واک کی روداد بھی اتنے دلچسپ انداز میں لکھتی ہیں اور یہاں تو اتنی مزے دار باتیں تھیں!جگہ کی قلت کا بیان پڑھ کر خوب ہنسی آئی (ویسے آپس کی بات ہے اس وقت تو سخت ٹینشن تھی۔چہرہ یقیناً فق ہوگا! اس نشست کے لیے مخصوص جگہ پر قافلے در قافلے ٹھہرائے جا چکے تھے۔ہم اپنے طور پر نشست ملتوی کرنے کے مشورے کے منتظر تھے مگر لوگوں کا ذوق شوق دیکھ کر پسپائی کرنی پڑی اور اسی بیٹھی ہوئی آواز اور اٹھک بیٹھک کرتے شرکاء کے ساتھ یہ تقریب منعقد ہوئی.....!)اس ادھوری نشست کا احوال کچھ ہم نے بھی لکھا ہے۔جن پھولوں کا ذکر کر کے قانتہ نے ایک شگفتگی کا تاثر دیا ہے،ان کا حصول اس وقت ناممکن سا تھا مگر فرشتے کس طرح مدد کرتے ہیں یقین آ گیا !اللہ اکبر!ایک پھول ہی کیا ہر کام جیسے اللہ کی فوج کے ہاتھوں سرانجام پا رہے تھے۔

اجتماع عام کے حوالے سے مزید تاثرات کی ضرورت ہے کہ یہ آئندہ کے لیے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔مختلف انداز اور الفاظ سے ہم اس کا جائزہ لے کر عوام الناس تک پہنچا سکتے ہیں۔انتظار رہے گا۔

باقی تمام تحاریر اپنی جگہ لاجواب ہیں۔دو کہانیوں کے حصہ اول پڑھ کر خیال آیا کہ کوئی ایک مکمل کر لی جاتی؟ خیر دونوں مصنفاؤں کو مطمئن کرنا ضروری تھا! قاری کا اشتیاق برقرار رہنا چاہئیے !حمیرا خالد کی تحریر پڑھ کر توکل کی مثال تقویت کا باعث بن رہی ہے۔

حریم ادب کے فیس بک صفحے پر بتول پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔اسے استعمال کرنیوالی بہنیں وہاں سے بھی مستفید ہوسکتی ہیں ۔امید ہے قارئین بتول ''نوید فکر'' پڑھ کر مصنفہ اور حریم ادب کو ضرور رائے سے آگاہ کریں گی!

☆☆☆

رمّانہ عمر۔ریاض

ماہنامہ بتول کے اکتوبر کے شمارے کا ''محشر خیال'' پڑھا جس میں محترمہ قانتہ رابعہ نے شکوہ کیا ہے قارئین سے۔اسی شکوے نے قلم اٹھوالیا۔بالکل درست فرمایا قانتہ بہن نے کہ ہر تحریر قاری کی رائے مانگتی ہے۔میں جب کسی دستکار کے اسٹال پر جاتی ہوں تو چاہے ہاتھ سے بنے اس آئیٹم کو نہ خریدوں مگر بنانے والے سے دو چار تعریفی جملے ضرور کہتی ہوں۔ہر تخلیق کار نے محنت،محبت اور وقت لگا کر ہمارے لئے اپنی تخلیق تیار کی ہوتی ہے۔لکھاری اپنے خیالات،الفاظ کے چناؤ اور جدت فکر کے موتی بکھیرتا ہے ہمارے لئے افسانہ یا کہانی یا نظم تحریر کرتا ہے تو اتنا حق تو بنتا ہے کہ ہم اس کی تحریر پر رائے دیں اور اس کے لئے اپنا کچھ وقت لگائیں۔چلئے میں تو ایک قاری ہونے کے ناطے اپنی سستی کو تسلیم کر رہی ہوں اور آج ہی ''قلم پر طاری سکتہ اور اظہار رائے پر طاری گونگے پن'' کو دور کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

لیجئے قانتہ بہن اب نشتر لے کر سب سے پہلے آپ ہی کے افسانے ''اے طائر لاہوتی'' کا آپریشن شروع کرتے ہیں۔یہ بتایئے پچھلے چند ماہ سے آپ کے افسانے مختصر ہو ہو کر ''افسانیاں'' کیوں بنتے جا رہے ہیں۔بلاشبہ موضوعات نئے تھے مگر ہر ایک پہلے سے زیادہ تشنہ لگا۔معذرت کیساتھ! کچھ مزا نہیں آیا۔اس افسانے کا نہ تو پلاٹ گہرا ہے نہ ہی کرداروں کی آپس میں کشمکش نہ ہی کلائمکس آتا ہے۔بس ٹھنڈا ٹھنڈا سا ہے۔وہ لڑکی عالیہ جو اپنی آپ بیتی سناتی ہے اس میں بھی اس کی اندرونی کشمکش بے تاثر سے انداز میں سپاٹ طریقے سے سنا جاتی ہے۔اب آپ خود ہی بتایئے زندگی کے عام سے واقعات کو آپ کا انداز تحریر اور افسانوی ٹچ ہی تو مزے دار بناتا ہے ناں! وہ کہں کھو گیا! یہ آپ کا انداز تو نہ تھا.....

اس کے برعکس اگست کا افسانہ ''طوق'' اگرچہ پرانے موضوع یعنی جہیز کی لعنت پر تھا مگر مختصر ہونے کے باوجود افسانوی لوازمات بھی تھے اور دل کو چھو لینے والا انداز تھا مجھے بہت پسند آیا۔

اکتوبر میں فرحی نعیم کا ''تہی داماں'' بہت موثر تھا۔آخر میں تو اس نے رُلا ہی دیا۔جس کے ٹکڑوں پر اولاد نے ساری زندگی عیش کیا اسی کو گھر کا فرش تک میسر نہ آیا۔اولاد کی بے حسی پر موثر تحریر تھی۔''نزہت ظفر'' کا ''سرگزشت'' بہت اچھا افسانہ تھا۔چلتے چلتے افسانے نے ایسا موڑ لیا کہ ہم حیران رہ گئے شروع سے جسے مظلوم سمجھ رہے تھے آخری صفحات میں وہی کردار ''علی'' ایک بے حس مرد ثابت ہوا۔اس کا موضوع بھی نیا تھا اور دلچسپی بھی آخر تک قائم رہی۔''بیگ کا سفر'' بڑا ہی دلچسپ تھا۔حقیقت میں ہم سب کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ شرما حضوری میں دوسروں کے سامان لے لیتے ہیں پھر بعد میں روتے ہیں۔اس تحریر سے بڑے اچھے سبق ملے۔

''میمونہ حمزہ'' کے سفر نامے تو مجھ سے ایک پیراگراف سے زیادہ پڑھے نہیں جاتے۔سفر نامہ لکھنے کا طریقہ یہ تو نہیں ہوتا کہ ''صبح اٹھے، چائے پی'' سے لے کر ''رات کو تھکے ہارے واپس آئے اور سو گئے'' تک کا پورا ڈائری نامہ یا روزنامچہ بیان کیا جائے۔سفر نامہ تو دوران سفر و سیاحت نت نئے تجربے اور حیران کن و دلچسپ جگہوں کے بیان پر مشتمل ہونا چاہیے ورنہ قاری کو اس سے کیا دلچسپی کہ آپ کا جہاز کتنا لیٹ تھا۔آپ نے ایئر پورٹ پر کتنا انتظار کیا اور گھر واپس پہنچنے پر آپ کے گھر بجلی تھی یا لوڈ شیڈنگ؟ وغیرہ وغیرہ۔

''گوشہ عافیت'' کی کہانیاں بہت ہی اچھا سلسلہ ہے کاش ''جہاں آرا مظفر'' صاحبہ جاری رکھ سکیں۔خود ذاتی طور پر گوشہ عافیت لکھ چکی ہوں ہم جو اپنے گھروں کے گوشہ عافیت میں متمکن ہیں کبھی سوچ

بھی نہیں سکتے کہ کس طرح ٹھوکریں کھاتے یہ لوگ ''گوشہ عافیت'' تک پہنچتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب ٹیم والوں کو اس کام پر بہترین جزا دے (آمین) اب اجازت چاہوں گی بتول سے درخواست ہے کہ ہم ریاض والوں کی تحریروں پر بھی نظر کرم کیا کریں ناں!

☆ رمانہ! قلم پر طاری سکتہ دور کرنے کا شکریہ! (مدیرہ)

☆.....☆.....☆

ارم آصف صدیقی۔ جدہ

اللہ رب العالمین سے دعا گو ہیں کہ آپ سب کو امان و عافیت میں رکھے۔ ایک لمبے عرصے کے بعد بتول پر تبصرہ کرنے کیلئے قلم اُٹھایا ہے۔ ایک وجہ تو مصروفیت، دوسرے یہ کہ تبصرہ یا کوئی اور تحریر روانہ کریں بھی تو کوئی حوصلہ افزائی نہیں۔ اسی وجہ سے قلم پھر سست پڑ جاتا ہے۔ یوں بھی اکتوبر کا بتول وصول کرتے کرتے نومبر کا آدھا مہینہ گزر جاتا ہے اور نومبر کا شمارہ جب ہاتھ میں آتا ہے تو دسمبر شروع ہو جاتا ہے۔

ماہِ اکتوبر اور نومبر دونوں ہی مرتبہ بتول کا سرِ ورق خوبصورت رنگوں سے سجا نظر آیا۔ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ قانتہ رابعہ آج کل مختصر مگر پراثر لکھ رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً ہر ماہ ہی بتول میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ نومبر میں حفصہ محمد افضال کا افسانہ ''بی بی سواری'' موضوع اور پیغام کے اعتبار سے بہت اچھا تھا لیکن فزکس سے متعلق انگریزی کی موٹی موٹی اصطلاحیں اور الفاظ ہم جیسے سائنس پڑھنے والے لوگوں کے لیے تو مشکل نہ تھے مگر عام قارئین کی بوریت کا سبب ضرور بنے ہونگے۔ نوجوان نسل کی نمائندگی کرنے والی تین لڑکیوں کی آپس کی گفتگو بھی قابلِ غور تھی کہ کس طرح ہماری آج کی نسل روزمرہ گفتگو میں انگریزی کا بے جا استعمال بڑھاتی جارہی ہے۔ ''کاش ایسا ہو!'' روبینہ عاطف کی اچھی اور مختصر تحریر تھی۔ سچی کہانی ''جائے عبرت'' میں حقیقت کا سامنا کرایا گیا کہ اللہ کی حدود کا مذاق اُڑانے والوں کو نہ صرف آخرت بلکہ اِس دنیا میں بھی خسارہ اٹھانا پڑتا ہے۔ شاہدہ ناز قاضی کی کہانی ''محافظ'' آج سے پانچ یا چھ سال پرانے بتول میں پڑھ چکے تھے خیر اچھا انتخاب ہے۔ آپ سے پہلے بھی گزارش کی تھی کہ محترمہ بنت الاسلام یا پھر محترمہ سعیدہ احسن کے بہت پرانے افسانے بھی کبھی کبھار شائع کر دیا کریں۔ ''نقشِ یقین'' کے ساتھ نصرت یوسف اِس مرتبہ پھر بتول میں موجود تھیں۔ نصرت صاحبہ بہت اچھا لکھتی ہیں لیکن جب وہ طویل کہانیاں لکھتی ہیں تو پھر دلچسپی برقرار نہیں رہتی۔ حالانکہ ان کے بہت سے خوبصورت افسانے مثلاً ذائقہ یا ذہانت، ''پانیوں پر قدم''..... وغیرہ بتول کے صفحات پر جگمگاتے رہے ہیں۔ جو پیغام اور سوچ وہ قاری کو دینا چاہتی ہیں بغیر نصیحت کیے بہت اچھے انداز میں دے دیتی ہیں۔ مولانا مودودیؒ کی صاحبزادی سے ملاقات بھی اچھی تھی۔ یہ غالباً اسماء مودودی صاحبہ تھیں۔ قانتہ رابعہ صاحبہ ''میری لائبریری سے'' میں اچھی کتابوں سے خوب متعارف کرواتی ہیں۔ اس مرتبہ بھی انہوں نے ہمارے دلوں میں اُندلس کا سفرنامہ پڑھنے کا شوق پیدا کیا لیکن ان سے ایک درخواست ہے کہ برائے مہربانی کتاب کی قیمت اور صفحات بھی ضرور لکھ دیا کریں جیسا کہ ترجمان القرآن میں درج ہوتا ہے۔

''ہمارے ٹی وی چینلز پر کیا دکھایا جارہا ہے۔'' ایک چشم کُشا جائزہ تھا۔ خدا کرے کہ ہمارے اربابِ اقتدار اور عوام دونوں ہی کو کچھ عقل آ جائے کہ جو قومیں اپنی اصل سے رشتہ توڑ لیتی ہیں ان کا دنیا میں نام و نشان بھی باقی نہیں رہتا۔ بتول میگزین میں زینب بتول کے ہلکے پھلکے نے اچھا رنگ جمایا۔ یہ خوبصورت مزاحیہ خاکہ ہم خود زینب کی زبانی ہماری گزشتہ سال (۲۰۱۳ء) کی حریم ادب میں سن چکے ہیں۔ اس سال بھی 22 نومبر کو ہماری ادبی نشست منعقد ہوئی اور ساتھی بہنوں نے اچھی اچھی تحریریں پڑھ کر سنائیں۔ سیرتِ رسولؐ کے حوالے سے ایک مضمون ہم نے بھی لکھا ہے اگر مناسب لگے تو ربیع الاوّل کے شمارے میں شائع کر دیجئے گا۔ اچھا اب اجازت دیجئے۔

☆ ارم! آپ کا کوئی اور تبصرہ ہمیں گزشتہ مہینوں میں موصول نہیں ہوا (مدیرہ)

☆.....☆.....☆

پلاسٹک کا زہر

سائنسدانوں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ پلاسٹک میں شامل کئے جانے والے کیمیائی مادے سے لاحق خطرات سے دنیا کو آگاہ کیا جو انسانوں میں سنگین تولیدی خرابیوں کا سبب بن سکتا ہے۔ یہ بائی اسفینول اے (BP-A) کہلاتا ہے۔ اور دنیا میں استعمال کئے جانے والے نمایاں ترین کیمیائی مادوں میں سے ایک ہے جو بیشتر انسانی جسموں میں شامل ہونے کے واضح امکانات اور مواقع رکھتا ہے یہ روزمرہ استعمال میں آنے والی پولی کاربونیٹ پلاسٹک سے بنی تمام اشیاء میں استعمال ہوتا ہے مثلاً دودھ پینے کی بوتلیں، مشروبات اور پانی کی بوتلیں، مائیکرو ویو اوون کی پلیٹیں، تیل اور گھی کی پلاسٹک کی بوتلیں وغیرہ۔ BP-A پلاسٹک کو استعمال کے قابل اور سخت بنانے کے کام بھی آتا ہے۔

اس خطرے کی سختی سے نشاندہی کرنے والے سائنس دانوں نے اپنی رائے کا اظہار کرنے سے پہلے ایسے سات سو تحقیقی مطالعوں کا ازسرنو جائزہ لیا جن میں لیبارٹری میں جانوروں کیلئے خطرناک ثابت ہونے والے اس مادے کی انسانوں پر تحقیق کے نتائج شامل تھے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ نومولود بچے اور رحم مادر میں جنین اس خطرے کا انتہائی ہدف ہیں فکرمندی کی بات بھی یہی ہے کہ عمر کے اس حصے میں کسی بھی کیمیائی مادے کے اثرات نہایت آسانی سے مرتب ہو سکتے ہیں اور ان کی تلافی بھی ممکن نہیں رہتی۔

نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ہیلتھ (امریکہ) کی ایک نئی تحقیق بھی موجود ہے جس سے بی پی اے کے باعث ماں کے پیٹ میں اور نومولود جانوروں کو نقصان پہنچنے کی تصدیق ہوتی ہے۔

عورتوں کے تولیدی نظام کو اس سے خاص خطرہ ہے مثلاً رحم میں رسولیاں، رحم کا کینسر اور دیگر بیماریاں ہو سکتی ہیں یہ پہلا موقع ہے کہ بی پی اے کا تعلق نسوانی تولیدی ٹریکٹ کی خرابی سے جوڑا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے ہونے والے مختلف تحقیقی مطالعوں میں بی پی اے کے باعث جانوروں میں پروسٹیٹ اور Breast Cancer اور مادہ حیات کے جرثوموں میں کمی کے مسائل بھی سامنے آ چکے ہیں۔

انسانوں میں بی پی اے کیا اثرات مرتب کرتا ہے اس حوالے سے دنیا میں پلاسٹک سے خطرات پر اس تحقیق نے دنیا بھر میں بحث چھیڑ دی ہے۔

دوسری طرف پلاسٹک صنعت سے وابستہ افراد نے اپنے مفادات کو خطرے میں پڑتا دیکھ کر نہ صرف اس رپورٹ کو متعصّبانہ اور قابل مذمت قرار دیا ہے بلکہ یہ بھی کہا ہے کہ اخذ کردہ نتائج غیر یقینی اور غیر سائنسی ہیں۔

نومولود کو لاحق خطرات:۔

فارمولا دودھ میں جو ڈبے میں پیک ہوتے ہیں BP-A کی مقدار اس حد تک بڑھ سکتی ہے جو Environmental Working Group (E.W.G) کی مقرر کردہ ہے۔ اور بوتلوں سے دودھ پینے والے شیر خوار بچوں پر وہی منفی اثرات مرتب کرتی ہے جو اثرات جانوروں پر مرتب ہوئے ہیں۔ E.W.G نے (BP-A) کی سطحوں پر Infant formula Milk کے استعمال کا موازنہ کیا ہے جس کے مطابق اس دودھ سے پرورش پانے والے ہر سولہ بچوں میں ایک بی پی اے کی زائد مقدار کا شکار ہوگا۔ اس کے نتیجے میں ذہنی نشوونما متاثر ہوتی ہے، مردانہ اور زنانہ تولیدی نظاموں کو مستقل نقصان پہنچتا ہے اور بانجھ پن زیادہ ہوتا ہے۔

BP-A کیسے منتقل ہوتی ہے

☆ ڈبہ بند غذائی اشیاء سے

☆ دودھ کی طرح پلاسٹک پیکنگ میں بند غذائی اشیاء سے

☆ڈبہ بند پھل سبزیاں اور Nuts سے

☆ڈبہ بند چکن سوپ سے

☆ڈبہ بند دودھ سے

2005ء کی تحقیق کے مطابق تحقیق میں شامل 394 بالغ افراد میں 95 فیصد کے پیشاب میں BP-A پایا گیا۔ 2500 افراد پر ایک اور تحقیق کی گئی تو 93% میں یہ مادہ پایا گیا۔ BP-A افراد کی یہ تعداد تشویشناک ہے۔

لیبارٹری میں جانوروں پر ہونے والے تجربات مختلف بیماریوں سے BP-A کے تعلق کی نشاندہی کرتے ہیں۔ رپورٹ E.W.G اگست 2007ء کے مطابق امریکہ میں Prostate اور Breast Cancer، موٹاپے اور بانجھ پن کی شدت بڑھ رہی ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ امریکہ دنیا میں سب سے زیادہ Breast اور Prostate Cancer رکھتا ہے اور یہ صورت گزشتہ دو عشروں سے سامنے آئی ہے۔

تجارتی غذائی مصنوعات:۔

باہر کے ملکوں میں ڈبہ بند خوراکوں کا زیادہ رواج ہے اور اب پاکستان میں بھی آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے۔ کاروباری حلقے اپنے اس کام پر جمے ہوئے ہیں۔ وہ اب بھی یہی کہتے ہیں کہ ہمیں ابھی بھی اس کی ضرورت ہے کہ ڈبوں اور پلاسٹک کے لفافوں میں خوراک بند کر کے بیچیں۔

لیکن دنیا میں بالغ افراد کی نصف تعداد انہیں ہضم نہیں کر پاتی۔ بچوں کے ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ ان تیار مصنوعات سے بچے میں الرجی، خون کی کمی اور ذیابیطس کے امکانات بڑھ سکتے ہیں۔

امراضِ قلب کے ماہرین کے مطابق یہ خون کی شریانوں کو بند کر سکتی ہے اور اس سے کینسر کا بھی خطرہ ہے جبکہ ماہرین بشریات کہتے ہیں کہ دو برس کی عمر کے بعد ہمیں کسی مصنوعی غذائی ذریعے کی ضرورت نہیں۔ فکرمندی کی بات یہ ہے کہ انہیں پیک کرنے کیلئے پلاسٹک کے ڈبے استعمال ہوتے ہیں۔

پاکستان میں گورنمنٹ کی سطح پر کوئی کام نہیں ہوا۔ البتہ انفرادی سطح پر کئی بڑے بڑے سٹورز میں پلاسٹک کے لفافوں کا استعمال متروک ہو گیا ہے۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم

محبت کے رنگ

ہر طرف سرخ رنگ بکھر رہا ہے کہ یہ محبت کا رنگ ہے خوشی کی تلاش ہے۔ محبت کی امنگ ہے۔ اس دل کے نشان اور سرخ رنگ کے پیچھے کیا کہانی ہے؟ اور اس کہانی کی آڑ میں کتنے دل بہلاوے ہیں۔ دل کی خلش کو ختم کرنے کے کتنے جواز ہیں؟ ''محبت'' کے لفظ کے پردے میں کیا کیا تماشے ہیں؟ ہر تماشے پہ نفس کی اجارہ داری ہے۔ شیطان کی پھیلائی ہوئی دل فریبیوں میں کتنے ایمان والوں کا امتحان ہے۔ اور اس امتحان کے کتنے رنگ ہیں۔

ایک پرائی تہذیب اچانک، ایک دن یا ایک عمل سے کسی تہذیب پر قبضہ نہیں کر سکتی۔ خوشیوں، محبتوں کے رنگ اتنی آسانی سے غیروں کے رنگ میں نہیں رنگ جاتے۔ قوموں کی زندگی پل بھر میں نہیں بدل جاتی۔ پہلے کسی ایک فرد کی سوچ کا رنگ تبدیل ہوتا ہے وہ فرد اپنی سوچ کو دیوار پر چپکا دیتا ہے جیسے مٹھائی والے کی دکان پر کوئی انگلی شیرے میں ڈبو کر اس انگلی سے دیوار پر ایک میٹھا قطرہ لگا دے اور پھر اس دکان کے سارے منظر بدل جاتے ہیں ابتدا تو بس ایک ذرا سی مٹھاس سے ہوئی جس کی بظاہر کوئی وقعت بھی نہ تھی۔ آج ساری امت مسلمہ حلوائی کی دکان ہے اور میڈیا شیرے میں ڈبوئی انگلی دیوار پر چپکا دیتا ہے۔ یہ جو محبت کے نام پر تہذیب کا رنگ بدلا گیا، کیا یہ آج کی کہانی ہے۔ جب کوئی قوم اپنی ''زبان'' بدلتی ہے تو پھر ''بیان'' بھی بدلنا پڑتا ہے۔ ''بیان'' کرنے کے لئے وہی کچھ پڑھنا ہوتا ہے جس کی ''زبان'' استعمال ہو رہی ہو۔

کسی قوم کے صبح و شام اپنے نہیں رہتے۔ دن رات کا کوئی پیراہنا نہیں رہتا۔ جب وہ ''تاریخ'' اپنی استعمال نہ کرے۔ دن اور صبح و شام اپنی ''زبان'' کے نہ رہیں تو کھانے پینے کی تہذیب اپنی نہیں رہتی جب قوم دوسروں کے سامنے اپنے ''اوقات'' کی پرواہ نہ کرے تو منزل کی سمت ہی بدل جاتی ہے۔

جب منزل کا رُخ ہی بدل جائے تو پھر جذبات بھی اپنے نہیں رہتے وہ بھی ادھار لینے پڑتے ہیں۔ منزل بدل جائے تو راستہ بدلنا پڑتا ہے اور راہ بدل جائے تو منزل بدلنے کی اجازت نہیں لینی پڑتی۔ کوئی کوشش اور تگ و دو نہیں کرنی پڑتی۔ جب قافلے اپنی راہ بدل لیں تو ساتھی خود بخود بدل جاتے ہیں۔ اسی طرح محبتوں کا فیضان بہت سی آرزؤں کا رنگ بدل دیتا ہے۔ جیسے آج ہمارے اردگرد ایسی آرزؤں کی فراوانی ہے جس کے رنگ کچے ہیں۔ ان کچے رنگوں کو ہم اپنے دلائل سے پکا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً۔

یوم محبت منانے سے ہماری مراد ہر رشتے کی محبت ہے۔ ویلنٹائن کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے اگر آج کسی کو تحفہ دے دیا جائے۔ خوش ہونے کی کوئی قید تو نہیں۔ اتنی دکھ بھری دنیا میں کوئی دن تو محبت کے لئے ہو۔

محبت تو اللہ کی طرف سے تحفہ ہے۔ لو بھئی ہم اپنی بہنوں، سہیلیوں کو ہی تو Wish کر رہے ہیں۔

ہر عقل دلائل دیتی ہے اور معزز شریف اور دین دار گھرانوں میں بھی یہ دلائل اپنا رنگ دکھاتے نظر آتے ہیں۔ گویا کہ یہ محبت کا دن کوئی ایسا تہوار ہے جس کو اسلامی لباس پہنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جیسے سود، رشوت، شراب کے نام بدل کر ان کو حلال کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ابھی ہم بات کر رہے تھے صبح و شام دن رات کے اوقات اور تاریخ بدلنے کی۔ ذرا غور کریں کہ جب ہم نے اپنی ہجری تاریخ کا ذکر کرنا چھوڑ دیا تو کتنے اسلامی واقعات کو محض سرسری نظر سے اخبار و رسائل میں دیکھا جانے لگا۔ چاند کی تاریخوں کو تو بس ہم نے رمضان المبارک کے لئے یاد

رکھا قمری مہینوں اور دنوں کے نام بھول گئے۔ یہ تسلی دے کر کہ سارے دن اور مہینے اللہ کے ہیں۔ کھانے پینے کے اوقات کو ہم نے پرائی تہذیب کا لبادہ اڑھا دیا تو پھر نمازوں کا انتظار، نماز کی یاد اور تلقین سے ذہن خالی ہو گئے۔ کبھی صبحانہ، ظہرانہ، عصرانہ اور عشائیہ ہوتا تھا جس سے نمازوں سے قربت کا احساس زندہ رہتا تھا۔

زندگی مکہ اور مدینہ کے قرب و جوار میں رہتی تھی جب حیات و ممات کے ساتھ عربی مہینے اور ہجری سال کا ذکر لازمی ہوتا تھا ذہن اپنی تاریخ سے منسلک رہتا تھا۔ سچی بات ہے کہ جب سال مہینے، دن رات، صبح و شام اور دن کے اوقات پہ غیروں کی تہذیب کا رنگ چڑھ جائے تو پھر قلبی جذبات بھی اس سے محظوظ نہیں رہے۔ باہمی رشتوں کی دلی مٹھاس بھی انکل، آنٹی کی بھینٹ چڑھ گئی ہے۔ محبت کرنے اور خوش ہونے کے لئے کیا ہمارے پاس کوئی تہذیب نہیں ہے؟ مسلمان جس کا دین محبت امن و محبت اور احساسِ طمانیت سے شروع ہوتا ہے۔ خوشی اطمینان اور محبت کے سرور کے لئے غیروں کا دستِ نگر ہو سکتا ہے؟ مومن و مسلم ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ جو محبت اور امن کا سفیر ہے۔ سلامتی کا پیغامبر ہے اور مسلمانوں کی ساری تاریخ محبت و اخوت کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ مواخات مدینہ سے بڑھ کر کوئی مثال دنیا میں پائی جاتی ہے؟ محبت کا اس سے بڑا کوئی دن کوئی معاملہ ہے کسی تہذیب کے پاس؟ رب کائنات نے اسے ایک ہی رنگ عطا کیا ہے۔ خوشی کا رنگ، اطمینان قلب اور سرور کی کیفیت اسے ہر جگہ، ہر حال میں عطا کی گئی ہے۔ نیکی کرنے کا کوئی خاص لمحہ یا وقت مقرر نہیں، تو مسلمان جب نیکی کرتا ہے اسے خوشی ملتی ہے۔ جب وہ اپنے رب سے دن میں پانچ بار ملاقات کرتا ہے تو اسے راحت نصیب ہوتی ہے۔ اللہ کی محبت سے سرشار وہ جب اللہ کے بندوں سے خیر خواہی کا معاملہ کرتا ہے تو جواباً اسے محبت کا لازوال خزانہ عطا ہوتا ہے۔

مومن کے لئے ہر دن محبت کا دن ہے۔ ہر رشتہ محبت کا رشتہ ہے۔ انسانیت کا رشتہ، دین کا رشتہ، صلہ رحمی کرنے کی خوشی و طمانیت، حتیٰ کہ ہر جان دار نباتات و جمادات کے ساتھ لگاؤ، وہ تعلق جو محبت کے ابدی احساس کے ساتھ جڑا ہے یعنی ان تمام چیزوں کے مالک سے تعلق کا رنگ۔ رب کائنات سے محبت کا رنگ۔ جب دل اس رنگ میں رنگ جاتا ہے تو ہر چیز میں اس کا رنگ نظر آتا ہے۔ آسمان کی وسعتیں ہوں۔ زمین کی پہنائیاں ہوں۔ کوئی بھی مقام ہو کوئی بھی وقت ہو۔ زندگی کا کوئی بھی لمحہ ہو اسی کا رنگ نمایاں رہتا ہے۔ اور اس کے رنگ سے زیادہ پختہ رنگ کون سا ہو سکتا ہے؟ **صبغۃ اللہ و من احسن من اللہ صبغۃ۔** اس رنگ میں رنگے سارے رنگ محبت ہمارے نہیں۔

☆.....☆.....☆

ہوئے تم دوست جس کے

مسلم امہ کی 14 سو سالہ تاریخ میں دینی مدرسے کا تصور سب سے پہلے برصغیر میں انگریز گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے 1781 میں کلکتہ مدرسہ کھول کر پیدا کیا۔ اس سے قبل بغداد کے دارالحکومت سے شروع ہونے والی مدارس کی تحریک جو 1100 سے 1500 تک طلیطلہ کے تراجم کی انتھک کوششوں سے ہم آہنگ ہو کر دنیا بھر کے علوم کی قائد بنی، اس کے زیر اثر قائم ہونے والے تمام مدارس علم میں کوئی تخصیص نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک سید الانبیاء کی حدیث کے مصداق علم مومن کا گمشدہ مال تھا۔

اس امت کے تمام مدارس میں قرآن وسنت اور فقہ کے علاوہ جو علوم پڑھائے جاتے تھے ان میں علم طب، علم الادویہ، علم ریاضی، علم طبیعات، علم فلکیات، فلکیاتی جدول، امراض عین، علم المناظر، علم کیمیا، علم فلسفہ، علم تاریخ، علم موسیقی اور دیگر کئی علوم شامل تھے۔ اس تصور کو برصغیر کے مسلم مدارس نے بھی انگریز کی آمد تک قائم رکھا۔ مدرسہ رحیمیہ اور مدرسہ فرنگی محل کے نصاب ان ہی علوم پر مبنی تھے۔ یہی تعلیمی ادارے تھے جس سے علم حاصل کر کے لوگ طبیب بنتے تھے اور گاؤں گاؤں جا کر حکمت اور طب کا پیشہ اختیار کرتے تھے۔

آج بھی ان گھرانوں میں علم طب اور علم الادویہ کی کتابوں کے وہ نسخے مل جائیں گے جو ان مدرسوں میں پڑھائے جاتے تھے۔ ان ہی تعلیمی اداروں سے استاد پیدا ہوتے اور ہر گاؤں میں اتالیق مقرر ہوتے تھے۔ ایک ایسا غیر رسمی تعلیمی نظام پورے برصغیر پر رائج تھا جس کے نتیجے میں اس خطے میں شرح خواندگی 95 فیصد سے زیادہ تھی۔ ہزاروں صفحات پر مشتمل گورنمنٹ کالج لاہور کے پہلے پرنسپل G.W.Leitner جی ڈبلیو لائٹنر کی کتاب Indiginous Education in Punjab اس بات کی گواہی ہے کہ مغلیہ دور میں ہر گاؤں کی سطح تک بنیادی تعلیم کا تصور کس قدر مستحکم تھا۔

شرح خواندگی یہ نہیں تھی کہ اپنا نام لکھ اور پڑھ سکتا ہو بلکہ ہر پڑھے لکھے شخص کو فارسی پڑھنا، لکھنا آتی تھی، حساب کتاب پر دسترس تھی اور اسے قرآن یا وید پڑھنا آتی تھی۔ یہ سب اساتذہ جو گاؤں گاؤں پھیلے ہوئے تھے ان ہی مدارس سے پڑھ کر نکلے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ 1906ء کے تمام اضلاع کے گزٹیر اٹھا کر دیکھ لیں آپ کو ضلعوں میں عمومی شرح خواندگی 90 فیصد کے لگ بھگ نظر آئے گی۔ یہی حال 1911ء کی مردم شماری کی رپورٹ کا ہے۔ یہ تعلیم اور خواندگی کا جال ان ہی مدارس سے فارغ التحصیل افراد نے پھیلایا تھا۔

پورے برصغیر میں جو سول سروس تھی جس میں مالیہ وصول کرنے والے، زمین کی پیمائش کرنے والے جریب کش، کوتوال، عدالتوں کے قاضی، خزانے کے متولی، عمارتیں تعمیر کرنے والے انجینئر جنھوں نے تاج محل اور شالیمار جیسے شاہکار تخلیق کیے، یہ سب کے سب ان ہی مدارس سے علم حاصل کر کے ان عہدوں تک پہنچتے تھے۔ ایک مربوط تعلیمی نظام کے بغیر یہ لوگ آسمان سے نازل نہیں ہوتے تھے۔ اس دور میں برصغیر میں آنے والے ہر سیاح نے صرف اور صرف ایک چیز کی بے حد تعریف کی ہے اور وہ تھی اس خطے میں عام آدمی کی زندگی میں علم اور ادب کے علاوہ فلسفہ اور سیاسی امور کی اہمیت۔

1643ء میں جو کتاب یورپ میں چھپ کر عام ہوئی وہ سر تھامس رو کا سفر نامہ تھا۔ اس کا ایک نسخہ پنجاب آرکائیوز میں موجود ہے جس کی ورق گردانی آپ کو بتا دے گی کہ پورے ہندوستان میں ان تعلیمی اداروں کا کیسا جال بچھا ہوا تھا۔ صرف ٹھٹھہ جیسے دور دراز علاقے میں چار سو کالج قائم تھے۔ البتہ فرق ایک تھا اور وہ یہ کہ آج کے دور کی طرح امتحانات کے ذریعے پاس کرنے اور ڈگری دینے کا رواج نہ تھا۔ وہاں استاد اپنے شاگردوں کو روز پرکھتا تھا اور پھر ایک دن اعلان فرما دیتا تھا کہ اب میرا یہ شاگرد علم میں طاق ہو گیا ہے۔ چند بڑے بڑے سوالات یاد کر کے امتحان دے کر ڈگری حاصل نہیں کی جاتی تھی۔

1781 میں کلکتہ مدرسہ قائم کرنے سے پہلے انگریز نے اس علاقے میں 1757 سے مسلمانوں کے تمام تعلیمی اداروں پر پابندی لگا دی۔ اب وارن ہیسٹنگز نے اس ''دینی مدرسے'' کی بنیاد رکھی جسے صرف

اورصرف دینی تعلیم کے لیے مختص کیا گیا۔اس مدرسے کے فارغ التحصیل طلبہ کواسی طرح کی ذمے داریوں کا درس دیا گیا جیسا یورپ میں تحریک احیائے علوم کے بعد چرچ کے پادریوں کو دیا جاتا ہے یعنی پیدا ہونے پر بپتسمہ دے دو، شادی پر جوڑے کو قانونی حیثیت دے دو، مرنے کے بعد رسومات ادا کردو اور اتوار کی عبادت کی قیادت کرلو۔

یہ چار ذمے داریاں بالکل اسی نوعیت کے حساب سے برصغیر کے علماء کو سونپ دی گئیں اور مسلمانوں کے قدیم مدارس کی طرز پر عیسائی مشنری اسکول کھولے گئے۔ 1810 میں کلکتہ میں پہلا مشنری اسکول کھلا جس کے نصاب میں بائبل کی اخلاقیات ''Biblical Ethics'' اور عیسائی تعلیم کے ساتھ تمام دنیاوی علوم پڑھائے جاتے تھے۔انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا اور تمام سرکاری نوکریوں کے لیے انگریزی لازم قرار دے دی گئی۔ پورے ملک کے تمام تعلیمی اداروں سے قرآن وسنت خارج کردیا گیا اور اسے اسلامیات کے ایک اختیاری مضمون کی حیثیت دے دی گئی کہ جو کوئی اس کو پڑھنا چاہے پڑھ لے۔

تعلیم صرف اسکول اور کالج تک محدود ہوگئی اور اس کے بعد کے نوے سالوں میں وہ زوال آیا کہ 1947 میں انگریز جب برصغیر کو چھوڑ کر گیا تو شرح خواندگی 14 فیصد سے زیادہ نہ تھی۔اس دور زوال میں مسلمان مدارس نے وہ ذمے داری بخوشی قبول کرلی جو انگریز نے دی تھی اور ایک ایسی کھیپ تیار کرنا شروع کردی جو کم از کم قرآن وسنت کے علم کو محفوظ رکھیں اور اسے کونے کونے تک پہنچائیں۔مغربی تعلیم کی یلغار اور انگریز حکومت کے مقابلے میں اپنے دینی علم کا تحفظ ان مدارس کا بنیادی مقصد بن گیا اور جس لگن اور ایمانداری سے انھوں نے یہ فریضہ نبھایا اس کی مثال نہیں ملتی۔

بلوچستان کے قمر دین کاریز یا بسیمہ جیسے دور افتادہ گاؤں ہوں، سندھ میں مٹھی اور ڈیپلو کے ریگستان ہوں، پنجاب میں بھکر، راجن پور یا میانوالی کا بے سروسامان قصبہ ہو یا سرحد کی بلند چوٹی پر اباؤ کوئی بستی۔ پانی، بجلی، سیوریج، تعلیم، صحت اور دیگر سہولیات سے بے نیاز ان مدارس کا پڑھا ہوا ایک شخص صبح منہ اندھیرے مسجد کا دروازہ کھولتا ہے، صفیں درست کرتا ہے، چبوترے پر اذان دیتا ہے اور دن میں پانچ وقت نماز پڑھاتا ہے۔اکثر جگہ اس کی گزر بسر صرف اور صرف لوگوں کے گھروں سے کھانا یا شادی اور موت کی رسومات پر نذرانے کے سوا کسی اور چیز پر منحصر نہیں ہوتی۔

پورے ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے یہ لوگ جو دانستہ یا نادانستہ طور پر اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام کو زندہ رکھنے کی واحد علامت ہیں، یہ اگر موجود نہ ہوں تو لوگ اذان دینے اور نماز پڑھانے والے کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔انھوں نے یہ ذمے داری گزشتہ دو سو سال سے اس طرح نبھائی ہے کہ آج تک کسی مسجد کے دروازے پر تالہ نہیں لگا کہ مولوی ہڑتال پر ہے۔کبھی کوئی نماز لیٹ نہیں ہوئی۔

یہ ہیں وہ لوگ جو اس ملک کے کوچے کوچے اور قریے قریے میں موجود ہیں۔ جہاں سرکار کا نام ونشان نہیں وہاں بھی موجود ہیں۔کسی گاؤں میں چلے جائیں آپ کو سرکار کا اسپتال ویران نظر آئے گا، وہاں کا اسکول بے آباد ہوگا، نہ ڈاکٹر کا کہیں پتہ چلے گا اور نہ ہی استاد کا لیکن وہاں ایک ہی آباد اور روشن مقام ہوگا اور وہ اللہ کا گھر جس کی رکھوالی ایک مفلوک الحال درویش مولوی کررہا ہوتا ہے۔

اس مولوی سے دشمنی کی اور کوئی وجہ نہیں، بس صرف ایک ہے کہ یہ اللہ کے نام کا دانستہ یا نادانستہ طور پر نمائندہ بن چکا ہے اور اپنا فرض نبھا رہا ہے۔ لیکن جب بھی میرے ملک کے ''عظیم'' دانشوروں کو موقع ہاتھ آتا ہے وہ ان مدارس کو سرکاری کنٹرول میں کرنے کا نعرہ بلند کرنے لگتے ہیں۔کبھی کسی نے سوچا ہے اس کے بعد کیا ہوگا۔وہی جو تمام اداروں کے ساتھ ہورہا ہے۔

مولویوں کا تنخواہیں بڑھانے کے لیے اور دیگر مراعات کے لیے احتجاج شروع ہوگا، دھرنے، مساجد پر تالے اور درس وتدریس کا خاتمہ۔وہی حال جو ہم نے اپنے باقی تمام محکموں کا کیا ہے۔ مجھے اپنے ان عظیم دانشوروں کی یہ منطق اچھی لگتی ہے کہ تمام مدارس کو سائنسی اور جدید علوم پڑھانے چاہئیں تاکہ روحانی اور مادی ترقی ساتھ ساتھ ہو لیکن کیا یہ منطق کالجوں یونیورسٹیوں اور اے لیول وغیرہ پر لاگو نہیں ہوتی کہ انھیں بھی قرآن وحدیث پڑھایا جائے تاکہ معاشرہ میں ایک ہی طرح کا نظام تعلیم اور ایک طرح کے انسان جنم لیں۔

ان اداروں میں تو جو تھوڑا بہت اسلام موجود ہے، یہ لوگ اس کو بھی نکالنے کا نعرہ لگاتے ہیں۔اصل مقصد صرف یہ ہے کہ تعلیم سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو دیس نکالا دے دو۔اسے امن کی شرط کہا جارہا ہے۔یورپ نے 1900 تک دین کو تعلیم سے نکال دیا تھا۔کیا وہاں امن آ گیا؟ اس کے بعد اس نے 2 عالمی جنگیں لڑیں اور کروڑوں انسانوں کا خون بہایا۔شاید تاریخ کسی کو یاد نہیں یا وہ یاد کرنا نہیں چاہتا۔